ہفت روزہ
# ندائے خلافت
لاہور
۵ ستمبر ۱۹۹۵ء

☆ ملک میں چھوٹے صوبے ------یا؟ : نقطہ نظر
☆ مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے لئے ایک قابل فارمولا : خطاب جمعہ
☆ تشدد کی لہریں --اسباب و علل اور ذمہ داریوں کا تعین : ایک یادگار تحریر

## حدیثِ امروز

# آزادیٔ نسواں

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

پاکستان میں عورت کی آزادی کا مطالبہ ہونے لگا ہے۔ اگرچہ یہ مطالبہ سردست عمومی نہیں تاہم غور طلب ضرور ہے۔ آج کل کی محافل میں یہ جملہ بکثرت دہرایا جاتا ہے کہ ہمارے بے شمار مسائل ہیں اور یہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری دانست میں مسئلہ تو ایک ہی ہے' دین سے عملاً دوری۔ اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ سب اسی ایک کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال عورت کی آزادی کا مطالبہ ایک نیا شوشہ ہے جس کا تدارک سمجھداری سے کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ مرد اور عورت حیات انسانی کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے مابین خوش دلی کے بغیر معاشرے کی خوشحالی ممکن نہیں۔ عورت کی آزادی کا مطالبہ ایسے خاص طبقے نے اٹھایا ہے جو دین سے نابلد ہی نہیں باغی بھی ہے۔ البتہ شہری آبادی کی تعلیم یافتہ نوجوان نسل میں اس مطالبے کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ مغربی ممالک کی عورت نے بھی ایسا ہی مطالبہ لگ بھگ ڈیڑھ سو سال قبل کیا تھا۔ اسے آزادی ملی' مخلوط زندگی کے جوہر کھلے' عورت شمع محفل بنی' نائٹ کلب عام ہوئے' اشتراکیت مقبول ہوئی اور یوں گھریلو زندگی تباہ ہو کر رہ گئی۔ آزاد عورت نے بیوی کہلانا ہتک سمجھا اور آزاد مرد نے ایک بیوی کا ہو رہنا پسند نہ کیا۔ چنانچہ شادی کا رواج کم ہوتا چلا گیا اور Permissive Society (ایسا معاشرہ جس میں رضامندی کے ساتھ جنسی تعلقات کی کھلی آزادی ہو) کا انداز مقبول ہوا' جس کا ثمرہ اب ایڈز کی شکل میں وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے اور یہ عذاب الٰہی سے کم نہیں۔

ہمارا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ شرم و حیا ہمیشہ مشرقی تہذیب کی پہچان رہی ہے اور دین اسلام تو اسے نیکی کا محور قرار دیتا ہے۔ جہاں قرآن مجید میں عورت کے لئے ستر و حجاب کے ضمن میں واضح احکامات موجود ہیں وہاں مردوں کو بھی اپنی نگاہیں نیچے رکھنے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے' لیکن عام مشاہدہ یہ ہے کہ پاکستانی خاتون مرد کی نسبت زیادہ دین پسند ہے۔ اگرچہ شرعی پردہ جو دراصل عورت کی عظمت و عصمت کی پہچان اور اس کے احترام کی ضمانت ہے اب وطن عزیز میں خال خال ہی خوش نصیب لوگوں میں بحال ہے۔ تاہم ہمارے ہاں جو خواتین کم تر پردے کے ساتھ باہر آتی ہیں ان کے چہروں پر بھی مردوں کی نسبت زیادہ شریفانہ وقار' آنکھوں میں زیادہ جھکاؤ اور انداز میں زیادہ جھینپ نظر آتی ہے۔ بلاشبہ یہ دین اسلام کی برکات ہیں' اگرچہ پوری طرح عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہم بتدریج ان سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر مذکورہ بالا توضیح صحیح ہے تو پھر سوال ابھرتا ہے کہ پاکستان میں عورت کی جانب سے آزادی کا مطالبہ کیونکر؟۔ ہماری نظر میں اس کی دو وجوہات ہیں۔ اولاً یہ کہ چونکہ خواتین ملک کی آبادی کا نصف حصہ ہیں اور ووٹوں کی کل تعداد کا آدھا انہی کے قبضے میں ہے لہٰذا موجودہ حکومت نے جس کی سربراہ خاتون ہے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عورت کی آزادی کے مطالبے کو پروان چڑھا کر خواتین کی خوشنودی حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اسی لئے وومن (Women) بینک' وومن پولیس اسٹیشن' وومن جج' اسمبلی میں خواتین کی نشستوں کی بحالی وغیرہ کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ثانیاً (دوسری وجہ یہ ہے کہ) جدید تعلیم یافتہ اور آزاد و مخلوط ماحول کی رسیا خواتین کے محدود لیکن مخصوص اور بااثر طبقے نے پاکستانی عورت کی دکھتی رگ کو چھیڑ کر اس کی ہمدردی کے بھیس میں آزادیٔ نسواں کا مطالبہ برسرعام لا کر اپنے لادینی نظریئے کی آبیاری شروع کر دی ہے۔ یہ ہے وہ فتنہ جس کا بروقت سدباب

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

قیمت : ۶ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

## الحمد

**تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہان کا پالنے والا ہےO**

(اس کائنات کی حقیقت کے بارے میں غور و فکر کرنے والا ہر سلیم الفطرت شخص بالآخر توحید تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ تمام تعریفیں اور تمام شکر اس ذات کو سزاوار ہیں جو پورے جہاں کی پالنہار ہے)

**بے حد مہربان نہایت رحم والاO**

(اس پروردگار کی نمایاں ترین صفت رحمت ہے اور جہاں اس رحمت کی شان یہ ہے کہ وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے وہاں اس میں ایک ہمہ وقت پرسکون بہتے ہوئے دریا کا سا وصف بھی موجود ہے۔)

**جو مالک ہے روز جزا کاO**

(وہ پروردگار جو اس کارخانہ قدرت کو چلا رہا ہے' وہی اس دن کا بلا شرکت غیرے مالک بھی ہے جب وزن اعمال کے لئے میزان نصب کی جائے گی اور ہر ایک کو اپنے کئے کی بھرپور جزا یا سزا مل کر رہے گی۔)

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

**ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیںO**

(جب خالق' مالک اور رازق وہی ہے تو یہ پیشانی کسی غیر کے در پر کیوں جھکے اور دست سوال کسی اور کے سامنے دراز کیونکر ہو! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ صرف تیری ہی پرستش کریں گے اور تجھ ہی سے اس کی توفیق کے طلبگار ہیں)

**ہماری رہنمائی فرما سیدھے راستے کیO**

(کہ انسان کے لئے محض اپنی عقل کے بل پر زندگی گزارنے کا وہ معتدل اور متوازن راستہ تلاش کرنا ناممکن ہے جو اسے اس دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے اور آخرت میں ناکامی و نامرادی سے بچا سکے گا لہٰذا وہ بارگاہ رب العزت میں التجا کرنے پر مجبور ہے کہ اے اللہ تو ہی ہماری رہنمائی فرما!)

**ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل فرمایا' جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔**

"ان لوگوں کے راستے اور طرز زندگی سے ہم پناہ مانگتے ہیں جو علم رکھنے کے باوجود اپنی شرارت نفس کے باعث غلط راستے پر چل کر تیرے غضب کا نشانہ بنے یا غلط فہمی کے باعث سیدھے راستے سے بھٹک گئے بلکہ ہم تو اس راستے کے جویا ہیں جو انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین کا راستہ ہے' آمین۔) (سورۃ الفاتحہ)

---

## جوامع الکلم

**تمام اہل ایمان فرد واحد کی طرح ہیں کہ اگر آنکھ میں تکلیف ہو تو پورا بدن بے قرار ہو جاتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو سارا جسم بے چینی اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔**

(واقعتاً اگر مسلمانوں کی کیفیت یہ ہو جائے جس کا نقشہ اس حدیث میں سامنے آتا ہے تو کسی دشمن طاقت کی کیا مجال کہ وہ مسلمانوں کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے) (مشکوۃ' بروایت نعمانؓ)

دار المطالعہ قرآن اکیڈمی
3/9/95

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
# ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۴ شمارہ ۳۶

۵ ستمبر ۱۹۹۵ء

11

مدیر : حافظ عاکف سعید

معاون مدیر : نثار احمد ملک

یکے از مطبوعات

تحریکِ خلافت پاکستان

۴۔اے، مزنگ روڈ، لاہور

مقام اشاعت

۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون : ۵۸۶۹۵۰۱

پبلشر : محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری

مطبع : مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ : -/۶ روپے

سالانہ زر تعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زر تعاون برائے بیرون پاکستان

| | |
|---|---|
| سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت | ۱۴ امریکی ڈالر |
| مسقط، عمان، بنگلہ دیش | ۱۰ 〃 〃 |
| افریقہ، ایشیا، یورپ | ۱۹ 〃 〃 |
| شمالی امریکہ، آسٹریلیا | ۲۰ 〃 〃 |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## ایڈیٹر کے ڈیسک سے

زیر نظر شمارے میں شامل امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ۲۵/اگست کے خطاب جمعہ کی تلخیص خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں امیر تنظیم نے اتحاد امت کی اہمیت پر زور دینے اور برعظیم پاک و ہند میں موجود دینی جماعتوں کے تاریخی پس منظر کے حوالے سے اتحاد کے امکانات کا ایک بھرپور تجزیہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، اتحاد امت کے لئے ایک قابل عمل فارمولا بھی پیش کیا ہے، اور اس فارمولے پر عمل درآمد کے آغاز کے طور پر جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کو اتحاد کی نہایت معقول پیشکش بھی کی ہے کہ جس کے لئے انہیں نہ صرف یہ کہ انتخابات میں شرکت کے ضمن میں اپنے سابقہ موقف میں بھی اچھی خاصی لچک پیدا کرنی پڑی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ اتحاد و اتفاق کے مبارک کام کی خاطر اور اپنی پیشکش کو بامعنی بنانے کے لئے انہوں نے اپنے سابقہ موقف میں ترمیم کو بھی گوارا کیا ہے۔ امیر تنظیم کی اس تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی، تینوں ایک وفاق کی شکل میں متحد ہو جائیں اور مل جل کر ملک میں غلبہ و اقامت دین کی راہ ہموار کرنے کے لئے فکری و نظری سطح پر بھرپور دعوتی کام کریں۔ الیکشن میں حصہ لینے کے امکان پر صرف اس وقت غور کیا جائے جب یہ یقین ہو جائے کہ ذہنی و فکری تبدیلی اس وسیع پیمانے پر ہو چکی ہے کہ اس وفاق کو ایک ہی ہلے میں اتنی عظیم اکثریت کے ساتھ انتخابات میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے کہ پھر ملک کے نظام کو بدلنے کے لئے آئین میں ضروری ترمیم ممکن العمل ہو سکتی ہو---- اس خطاب کی تلخیص تو زیر نظر شمارے میں شامل کر دی گئی ہے لیکن ارادہ یہ ہے کہ اسے مکمل صورت میں آئندہ "میثاق" میں شائع کیا جائے گا تاکہ امیر تنظیم کی یہ اہم تجویز اور غیر معمولی پیشکش اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ رفقاء و احباب کے سامنے آ سکے۔

دوسرا مضمون جو زیر نظر شمارے میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے، محمد علی شہاب صاحب کا تحریر کردہ ہے اور صوبوں کی تقسیم سے متعلق ہے۔ امیر تنظیم کی یہ رائے کہ صوبائی عصبیت کے خاتمے اور انتظامی سہولت کے پیش نظر صوبوں کی از سر نو تعیین ہونی چاہئے اور ملک میں چھوٹے صوبے تشکیل دیئے جانے چاہئیں، قارئین "ندائے خلافت" سے مخفی نہیں ہے--- لیکن یہ کڑوی گولی آسانی سے حلق سے اترنے والی نہیں ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ اصولی طور پر اس سے متفق ہونے کے باوجود اسے قابل عمل نہیں سمجھتے، بالخصوص کراچی کی موجودہ سنگین صورتحال کے حوالے سے ہمارے سندھی بھائی اس ضمن میں بہت سے تحفظات اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں، تاہم بعض سنجیدہ حلقوں کی جانب سے اس رائے کی پرزور تائید بھی سامنے آئی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال محمد علی شہاب صاحب کا یہ مضمون ہے جو حال ہی میں کراچی کے ایک معروف جریدے "The Universal Message" میں شائع ہوا۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ اس کے باوجود کہ یہ پرچہ جماعت اسلامی کے حلقہ متفقین کے زیر انتظام شائع ہوتا ہے، اور اس کے باوصف کہ صوبوں کی تقسیم کے مسئلے میں امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد صاحب کی رائے ڈاکٹر صاحب سے یکسر مختلف ہے۔ اس مضمون میں محترم ڈاکٹر صاحب کا نام لے کر ان کی رائے کی تائید نہایت بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ افادہ عام کے لئے ہم نے اس مضمون کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

"حدیث امروز" کے زیر عنوان "آزادی نسواں" کے حوالے سے ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان، محترم جنرل (ر) محمد حسین انصاری صاحب کی تحریر بھی نہایت وقیع اور لائق مطالعہ ہے۔ انہوں نے اپنے دلنشیں انداز میں اس مسئلے کے جن گوشوں پر ہمیں غور و فکر کی دعوت دی ہے وہ نہایت قابل توجہ ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مغرب سے درآمد شدہ اس فتنے کے تدارک کا صحیح طریقہ تو وہی جو انہوں نے تجویز فرمایا ہے۔ ہم جنرل صاحب کے ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر "حدیث امروز" یعنی اداریہ تحریر کرنے کی مستقل ذمہ داری قبول فرمائی ہے اور اسے نہایت خوشدلی کے ساتھ اور بہت احسن طریقے پر نبھا رہے ہیں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ میں اس موقع پر اپنے معاون اور رفیق کار جناب نثار احمد ملک کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کے بھرپور تعاون کے بغیر اس پرچے کا از سر نو اجراء ممکن نہ تھا۔ بحمد اللہ، اس نو آموز ٹیم کے زیر ادارت شائع ہونے والا یہ چوتھا پرچہ ہے جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر پرامید ہیں کہ اس پرچے کا تسلسل برقرار رکھ سکیں گے۔ وما توفیقنا الا باللہ۔OO

# مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے لئے ایک قابل عمل فارمولا !

## جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کو تنظیم اسلامی کی ایک غیر معمولی پیشکش !

### مذہبی جماعتوں کے تاریخی، فکری اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے

### امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا چونکا دینے والا خطاب جمعہ (۲۵/اگست ۹۵ء۔ مسجد دارالسلام لاہور)

امیر تنظیم اسلامی پاکستان و داعی تحریک خلافت پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے ۲۵ اگست کو اجتماع جمعہ سے "مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ضمن میں' ان کے تاریخی اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے ایک عملی تجویز اور اس کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی اہم پیشکش!" کے موضوع پر دو گھنٹے پر محیط مفصل خطاب فرمایا۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر حسب توقع حاضرین کی ایک بڑی تعداد مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں یہ خطاب سننے کے لئے موجود تھی۔

آپ نے خطبہ مسنونہ' سورۂ شوریٰ' سورۂ انبیاء' سورۂ مائدہ اور سورۂ آل عمران کے مختلف مقامات سے آیات کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد سورۂ مائدہ کی آیت "لکل جعلنا منکم شرعہ ومنہاجا" کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ دین ایک ہمہ گیر وحدت ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر حضورؐ تک ایک رہا ہے۔ البتہ جس طرح شریعتیں جدا اور الگ الگ تھیں ویسے ہی انبیاء علیہم السلام کے منہاج اور طریق کار بھی الگ اور جداگانہ تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی پیغمبرانہ جدوجہد کا ایک بڑا ہدف بگڑی ہوئی مسلمان قوم کو فرعون کی غلامی کے چنگل سے نکال کر فلاح و کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی اس سنت پر عمل پیرا ہو کر مسلم لیگ نے کام کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جگہ جگہ توحید کے مراکز قائم کئے۔ صوفیائے کرام نے ابراہیمی اسوہ کی پیروی میں پورے برصغیر میں شریعت اور تصوف کے حوالے سے دینی مراکز قائم کئے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر لوگوں میں گشت کر کے دین کی حقیقتوں کو آشکارا کیا۔ اس وقت تبلیغی جماعت نے جزوی طور پر اسی سنت عیسوی کو اپنا رکھا ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منہاج انقلابی تھا۔ ختم نبوت و تکمیل رسالت کے بعد اب قیامت تک کے لئے امت مسلمہ اپنے عروج اور اسلام کے غلبے کے لئے نبوی طریق کار پر عمل پیرا ہونے کی پابند ہے۔ اس نبوی طریق کار پر عمل پیرا ہو کر استحصالی نظام کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

آج کا موضوع انتہائی اہم ہے لیکن میں فقط نظری بحث میں نہیں پڑوں گا بلکہ اس موضوع کے عملی پہلوؤں پر گفتگو کروں گا۔ موجودہ حالات میں امت مسلمہ کے اتحاد کی ضرورت ہر شخص محسوس کرتا ہے لیکن یہ کام کیسے ہو' لائحہ عمل کیا ہو' اس کا تعین آسان نہیں!

### میرے مخاطب کون ہیں اور کون نہیں؟

اس ملک میں ان لوگوں کی کمی نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان غلط بنا تھا لہٰذا اس غلطی کی تلافی پاکستان کی تحلیل کی شکل میں ہو جانی چاہئے۔ اس طرز فکر کے حامل مذہبی و سیاسی لوگ تینوں چھوٹے صوبوں میں موجود ہیں۔ یہ لوگ آج کی میری گفتگو کے مخاطب نہیں ہیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کا موقف یہ ہے کہ بنا تو ٹھیک تھا لیکن اب بگاڑ کی ان حدوں کو چھو رہا ہے کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اس قدر مایوس ہیں کہ اصلاح احوال کی کوشش کرنے والوں کو بھی اس سے روکتے ہیں۔ اس وقت یہ لوگ بھی میرے مخاطب نہیں ہیں۔ تیسرے نمبر پر وہ لوگ آتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ بنا تو ٹھیک تھا لیکن بننے کے بعد خراب ہو گیا ہے لہٰذا اس خرابی کو دور کرنے کے لئے آخری وقت تک لگے رہنا چاہئے۔ یہ لوگ یقیناً میرے مخاطبین میں سے ہیں۔ چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جن کے بقول اس ملک کا قیام تو صحیح تھا' بعد میں حالات خراب ہوئے لیکن وہ پرامید ہیں کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بھی میرے مخاطب ہیں۔ پانچویں قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا واضح موقف یہ ہے کہ پاکستان بنتا یا نہ بنتا' رہے یا نہ رہے' دین کی دعوت و اقامت کی جدوجہد ہمارا فرض ہے جو ہم نے ہر حال میں ادا کرنا ہے۔ یہ لوگ بھی یقیناً میرے مخاطبین میں شامل ہیں۔

### پاکستان کو کس کس سے خطرہ ہے؟

اس وقت سلطنت خداداد پاکستان اس حال میں ہے کہ ایک جانب نیو ورلڈ آرڈر کے پردے میں یہودیوں کی عالمی بالادستی کا سیلاب ہے' جس کا فوری ٹارگٹ ایران' پاکستان اور افغانستان ہیں۔ دوسری جانب مسلمانان کشمیر کا جہاد حریت اب ان حدوں کو چھو رہا ہے جن کے نتیجے میں بھارت پاکستان کے خلاف کھلی جارحیت کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ تیسری جانب مسلح دہشت گردی اور کھلی بغاوت کی صورت میں نفاذ اسلام سے روگردانی کی سزا یعنی نفاق باہمی کا عذاب کراچی کی بندرگاہ سے ملک میں داخل ہو چکا ہے۔ چوتھی جانب معاشرتی بدامنی اور آوارگی' سیاسی خلفشار اور محاذ آرائی اور مالیاتی لوٹ کھسوٹ اور بندر بانٹ آخری حدوں کو پہنچ چکی ہے اور ان سب پر مستزاد مذہبی جماعتوں کا باہمی نفاق ہے جو روز بروز تقسیم در تقسیم کی صورت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

### ان خطرات کا اصل سبب کیا ہے؟

ان خطرات کے بہت سے فوری اسباب کے

تلخیص و ترتیب : نثار احمد ملک

علاوہ ' سب سے بڑا سبب ہمارا بحیثیت قوم اپنی اصلی منزل سے انحراف ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں سے ہم اللہ سے کئے گئے وعدہ کی مسلسل خلاف ورزی کرتے چلے آئے ہیں۔ ہماری منزل تھی نفاذ شریعت و قیام نظام اسلام' جس کو ہم نے یکسر بھلا دیا۔ اس وعدہ خلافی کا نتیجہ سورۂ توبہ کی ایک آیت کے مطابق یہ نکلا ہے کہ ہم نفاق باہمی اور نفاق عملی کا شکار ہو گئے ہیں' بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ یہ دونوں نفاق ہمارے قومی ماتھے کا نشان بن چکے ہیں۔

## اصل علاج؟

ہمارے اس قومی مرض کے کچھ علاج وہ ہیں جو فوری نوعیت کے ہیں' مثلاً لسانی و ثقافتی عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے صوبوں کی تقسیم اور مختلف قومیتوں کے سیاسی و معاشرتی حقوق کا خیال رکھنا' وغیرہ۔ لیکن اس مرض کا اصل علاج صرف ایک ہے' اور وہ ہے نظام اسلام کا مکمل نفاذ' بغیر کسی استثناء کے۔

## منزل سے انحراف کی اصل وجہ؟

اس ملک میں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام پذیر نہ ہونے کے جہاں بہت سے دوسرے اسباب ہیں' وہاں سب سے اہم سبب دینی جماعتوں کی غلط حکمت عملی ہے۔ ہماری دینی جماعتوں نے انتخابی سیاست کو اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ سیکولر سیاسی جماعتوں کی پشت پناہی کی ہے۔ انتخابی سیاست کو اختیار کرنے کا آغاز جماعت اسلامی نے کیا جبکہ دوسرے مذہبی گروہ اس کے متبعین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب نے اسلام کو بطور نعرہ استعمال کیا لیکن اپنے اپنے فرقے اور مسلک کے حوالے سے اپنا علیحدہ سیاسی تشخص اجاگر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پانچ خانوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس تقسیم کے بعد اسلام محض ایک سیاسی نعرہ بن کر رہ گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مذہبی سیاسی جماعتیں مزید دھڑوں میں منقسم ہوتی چلی گئیں۔

## اصلاح احوال کی صورت

مذہبی عناصر کے انتشار و افتراق کو کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ محاذ آرائی سے گریز کیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جو ایک دوسرے سے جتنا قریب ہیں وہ آپس میں ادغام نہیں کر سکتے تو وفاق کی کوئی شکل ہی اختیار کر لیں۔ اس وفاق کے لئے پہلے قدم کے طور پر یہ بات ضروری ہے کہ جو جماعتیں ایک ہی فکری پس منظر اور سیاسی مسلک رکھتی ہیں ان کی باہمی تقسیم ختم ہو جائے' جیسے جمعیت علماء اسلام دھڑوں میں تقسیم ہے۔ اس طرح کی تقسیم ختم ہونی چاہئے۔ اگلے قدم کے طور پر ایسے مذہبی عناصر جو ایک ہی فقہی و اعتقادی پس منظر رکھتے ہیں' وہ آپس میں ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔ دیوبندی و بریلوی بنیادوں پر بننے والی جماعتوں کے پس منظر کو دیکھا جائے تو ان میں تین چیزیں مشترک ہیں۔ ان کے عقائد قریباً ایک سے ہیں۔ سوائے چند نزاعی مسائل کے' اگرچہ ان کو بھی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے "فیصلہ ھفت مسئلہ" میں حل کر دیا ہے۔ یہ دونوں ایک فقہی مسلک رکھتے ہیں۔ ان دونوں مسالک کے مدارس میں پڑھائی جانے والی "امہات الکتب" ایک ہیں۔ اور سلاسل تصوف کے ضمن میں بھی ان دونوں میں اتفاق ہے۔

## اس انتشار کا پس منظر

سو سال پہلے دیکھا جائے تو یہ لوگ فقہ میں حنفی اور تصوف کے کسی نہ کسی سلسلے سے وابستہ تھے۔ یہ تبدیلی دارالعلوم دیوبند کے قیام سے واقع ہوئی جو خود اپنی جگہ ایک بھرپور مکتب فکر کی صورت اختیار کر گیا۔ اس طرح یہ حنفی و صوفی لوگ دیوبندی اور بریلوی میں منقسم ہو گئے۔ یہ تقسیم اس صدی کے آغاز اور پچھلی صدی کے اختتام میں دو شخصیات' مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کے باہمی فکری و نظری ٹکراؤ کی وجہ سے شدت اختیار کر گئی جبکہ پچھلی صدی میں یہ ٹکراؤ مولانا فضل حق خیر آبادیؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے درمیان تھا۔

## مذہبی سیاسی جماعتوں کا سیاسی پس منظر

ماضی میں مذہبی سیاسی جماعتوں کا ایک گروہ وہ تھا جس کا نقطہ نظر تھا کہ انگریزوں سے نجات کے لئے ہندوؤں سے اتحاد ضروری ہے۔ یہ لوگ "جمعیت علماء ہند" کے نام سے منظم تھے اور انہیں مولانا سید حسین احمد مدنی جیسی بھاری بھرکم سیاسی و مذہبی شخصیت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اس نقطہ نظر کا حامل ایک دوسرا گروہ "مجلس احرار اسلام" کے عنوان سے بھی سرگرم عمل تھا۔ تیسرا گروہ ان علماء پر مشتمل تھا جو مسلم لیگ کے حلیف تھے۔ ان میں دیوبندی مکتب فکر سے تھانوی گروپ بہت زیادہ سرگرم عمل تھا جبکہ اکثر بریلوی علماء و مشائخ نے بھی مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ ان تینوں گروہوں کے بین بین ایک چوتھا گروہ بھی تھا جس نے مسلم قومیت کی تائید' مسلم لیگ کی پالیسی سے اختلاف اور مشترکہ قومیت کی شدید مخالفت کی۔ ان کا موقف تھا کہ مسلم لیگ کے اختیار کردہ طریقہ کار سے اسلام نہیں آ سکتا۔ یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کا سیاسی موقف تھا۔

## اتحاد کیسے ہو؟

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ایک ہی سیاسی و مذہبی پس منظر کی حامل جماعتوں سے مختلف دھڑے متحد ہوں۔ جمعیت علماء پاکستان کے دونوں بڑے دھڑے اور چھوٹے گروہ باہم متحدہ ہوں' اسی طرح جمعیت علمائے اسلام کے دونوں گروہ اکٹھے ہوں۔ ایک ہی جماعت کا دو دھڑوں میں بٹ جانا محض شخصیات کے باہمی ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ کم از کم ان کے پاس علیحدہ علیحدہ دھڑے بندی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کے بعد اگلے قدم کے طور پر یہ دونوں بڑی مذہبی سیاسی جماعتیں آپس میں متحد ہونے کی کوشش کریں۔

جہاں تک تعلق تبلیغی جماعت کا ہے تو وہ ایک مذہبی تبلیغ کے لئے غیر سیاسی سطح پر سرگرم عمل جماعت ہے۔ اس کے رد عمل کے طور پر بریلوی مکتب فکر کی طرف سے "دعوت اسلامی" کے نام سے ایک جماعت بڑی تیزی سے منظم ہو رہی ہے۔ دعوت کا کام ان دونوں میں قدر مشترک کا درجہ رکھتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے قریب آنے کی کوشش کرنی چاہئے اور پورے دین کی دعوت کو اپنا شعار بنانا چاہئے۔

اس ملک میں دو اور جماعتیں بھی موجود ہیں جو بعض اعتبارات سے ایک دوسرے سے بہت قرب رکھتی ہیں۔ یہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کی "تحریک منہاج القرآن" اور مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کی "تنظیم الاخوان" ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں فرقہ واریت سے کافی حد تک بالاتر ہیں لیکن اس کے باوجود مقدم الذکر کو بریلوی اور موخر الذکر کو دیوبندی حلقہ کی حمایت حاصل ہے۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ ان دونوں کو نہ ہی کٹر بریلوی پسند کرتے ہیں نہ کٹر دیوبندی!! تیسری چیز جو دونوں میں مشترک ہے وہ خوابوں اور کشف کی بنیاد پر اپنا لائحہ عمل استوار کرنا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے سے اتحاد کر لیں۔

## علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے وارث

علامہ اقبال کے انقلابی افکار اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی حزب اللہ سے متاثر ہو کر مولانا مودودی میدان میں آئے۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی داغ بیل ڈالی۔ جماعت اسلامی کی انفرادیت ہے کہ

یہ ایک شخص کی فکر اور دعوت کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی۔

## جماعت اسلامی کے اوصاف

(۱) فرقہ واریت سے بلند تر (۲) اصل دین کی تفہیم (۳) دعوت و اقامت دین کی عملی جد و جہد (۴) جماعت کے ارکان میں کالج اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت (۵) "اسلامی حکومت کیسے قائم ہو سکتی ہے" کے ضمن میں ایک راستہ کا تعین' جس کے دو نکات بہت واضح تھے کہ پہلے خود مسلمان بنو اور پھر کسی مضبوط نظم میں جڑ جاؤ جبکہ تیسرا نکتہ کہ آخری اقدام کیسے ہوگا' واضح نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کا آغاز اصولی اسلامی انقلابی جماعت کی حیثیت سے ہوا۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد انتخابی سیاست کا راستہ اختیار کرنے کے بعد اس کی حیثیت ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کی ہو گئی۔

## جماعت اسلامی کی تاریخ کے تین خروج

جماعت کی تاریخ میں تین مواقع ایسے ہیں کہ جب بڑے پیمانے پر ارکان کا جماعت سے خروج ہوا۔

پہلا خروج ۴۲ء میں خالص شخصی اختلاف کی وجہ سے ہوا۔ علماء کے حلقے سے آنے والے چند نمایاں افراد کا خیال تھا کہ مولانا مودودی کی فکر تو صحیح ہے لیکن اس کام کو کرنے کے لئے جو شخصیت مطلوب ہے' اس کے اوصاف مولانا میں نہیں ہیں۔

دوسرا خروج ۱۹۵۶ء میں ہوا جو خالصتاً پالیسی اختلاف کی بنیاد پر تھا۔ مجھ سمیت کچھ اکابر و اصاغر کا خیال تھا کہ الیکشن کی وجہ سے ہم غلط رخ مڑ آئے ہیں۔ اگرچہ اس وقت نکلنے والوں میں سے اکابرین کے سرخیل مولانا امین احسن اصلاحی کا مولانا مودودی پر یہ الزام بھی تھا کہ مولانا کے مزاج میں آمریت ہے۔

تیسرا خروج ۱۹۹۴ء میں ہوا۔ اختلاف کرنے والوں میں نمایاں نام جناب نعیم صدیقی کا ہے ان کا اختلاف بھی فی الاصل پالیسی کا نہیں ہے بلکہ بہت کچھ شخصی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قاضی حسین احمد نے الیکشن میں غلط ہتھکنڈے استعمال کئے ہیں نیز شوریٰ کے فیصلوں سے تجاوز کیا ہے۔ انہوں نے جماعت کے اندر بعض مالی اسکینڈلز کی بھی نشاندہی کی ہے۔

## خروج کے بعد

جماعت اسلامی سے مندرجہ بالا تینوں مواقع پر نکلنے والوں میں سے پہلے خروج والے تبلیغی جماعت میں شامل ہو گئے۔ دوسرے خروج والوں نے جماعت بنانے کی کوشش کی لیکن اکابرین میں سے کوئی نہ بنا سکا لیکن ایک نوجوان نے جو اب بڑھاپے کو پہنچ گیا ہے' اس کا بیڑا اٹھایا اور تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اجتماعیت قائم کی جبکہ تیسرے مرحلے پر خروج کرنے والے اب "تحریک اسلامی پاکستان" کے نام سے منظم ہو رہے ہیں۔

## تینوں جماعتوں کے نکات اتحاد

جماعت اسلامی' تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی میں مندرجہ ذیل نکات پر اتفاق ہے۔ (۱) دین مکمل ضابطہ حیات ہے جو اپنا غلبہ چاہتا ہے (۲) اس کے غلبہ کی جدوجہد ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (۳) اساسی طریق کار پر بھی تینوں کا اتفاق ہے (۴) اور یہ سارا کام قرآن کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔

## نکات اختلاف

تینوں جماعتوں میں بنیادی طور پر بنائے نزاع یہ اہم سوال ہے کہ آخری مرحلہ کیسے طے ہو۔ جماعت اسلامی کا موقف ہے کہ الیکشن کے ذریعے یہ مرحلہ طے ہوگا جبکہ تنظیم اسلامی کا الیکشن کے بارے میں مستقل موقف یہ ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں کوئی انقلاب الیکشن کے ذریعے برپا نہیں ہوا۔ الیکشن کسی قائم نظام کو چلانے کے لئے ہوتے ہیں قائم کرنے کے لئے نہیں۔ ہمارے موقف کا تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ الیکشن خواہ کتنے ہی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں ان کے ذریعے معاشی نظام پر پہلے سے مسلط طبقات ہی اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ ان میں حصہ لینا وقت کا ضیاع ہے۔ البتہ ہم اسے حرام نہیں سمجھتے۔ ہمارے موقف کا پانچواں نکتہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس راستے سے تبدیلی آسکتی ہے انہیں چاہئے کہ متحد ہو کر میدان میں آئیں تاکہ مذہبی و سیکولر ذہن واضح طور پر الگ الگ ہو جائے۔ تحریک اسلامی کا موقف آخری مرحلے کے بارے میں قریباً جماعت اسلامی جیسا ہی ہے اگرچہ ان کا خیال ہے کہ فی الحال الیکشن کو بھول جانا چاہئے۔

## تنظیم اسلامی کی پیشکش

تنظیم اسلامی کی ماضی میں یہ پیشکش رہی ہے کہ اگر جماعت اسلامی الیکشن میں حصہ لینا چھوڑ دے تو تنظیم اسلامی' جماعت اسلامی میں مدغم ہو جائے گی۔ بعد ازاں جماعت اسلامی سے نکالے جانے والے ایک شخص کی طرف سے جب یہ کہا گیا کہ جماعت اسلامی کو چاہئے کہ پچیس سال کے لئے الیکشن میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کرے۔ میں نے اس پر آگے بڑھ کر یہ پیشکش کی کہ اگر جماعت ایسا کرتی ہے تو میں اپنی اس چھوٹی سے اجتماعیت سمیت جماعت میں شامل ہو جاؤں گا۔ لیکن جماعت چونکہ الیکشن پالیسی پر مصر رہی' لہٰذا بات آگے نہ بڑھ سکی۔

اس وقت میری اور تنظیم اسلامی کی طرف سے جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کو یہ پیش کش ہے کہ (۱) تینوں جماعتوں پر مشتمل ایک وفاق قائم کیا جائے۔ (۲) یہ وفاق لوگوں کو اسلام کے نفاذ کی جدوجہد کے لئے قائل کرے' تینوں جماعتیں اس کام کے لئے اپنے وسائل اس میں کھپائیں۔ (۳) الیکشن میں حصہ لینے کے معاملے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ۱۹۴۵ء کے موقف پر اپنے طرز عمل کو استوار کیا جائے۔ مولانا کا یہ موقف رسائل و مسائل جلد اول صفحہ ۳۷۵ میں یوں بیان ہوا ہے کہ

"الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لئے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدہ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی (انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جبکہ :-

اولاً' ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لئے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لئے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً' ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً' انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

# چھوٹے صوبے ..... یا؟

تحریر : محمد علی شہاب / اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

## ان لوگوں کی بات پر توجہ دینی چاہئے جو کوچہ سیاست سے میلوں دور ہیں

## صوبوں کے مسئلے پر ہمیں اپنے پڑوسی ملک بھارت سے ہی سبق لینا چاہئے

ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں "اگر ملک کو بچانا ہے تو پورے پاکستان میں چھوٹے صوبے بنائیں۔ اصغر خان نے پاکستان کے بارہ صوبے بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ ایک ممتاز مذہبی شخصیت پانچویں صوبے کا نام بھی نہیں سننا چاہتی۔ ایک دوسرے راہنما جن کا تعلق ایک مذہبی سیاسی پارٹی سے ہے' مزید صوبوں کو پنڈورا بکس کھولنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ سندھ کے ایک سابق وزیر اعلیٰ زیریں سندھ پر مشتمل صوبے کی تجویز پر آزاد سندھ کا مطالبہ لا کھڑا کرتے ہیں۔ شہری حلقوں کے مسائل کی بات کی جائے تو سندھی قوم پرست بھارت کے ساتھ الحاق کی بات کریں گے۔ موجودہ وزیر قانون کا جو اتفاق سے ایم۔کیو۔ایم کے ساتھ مذاکرات میں مصروف حکومتی ٹیم کے سربراہ بھی ہیں' یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ سندھ کا کسی قسم کا نیا نظم قائم کرنا آئین کی خلاف ورزی اور غداری شمار ہوگا۔ گویا طرح طرح کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لایعنی باتوں کا کوئی مقابلہ ہو رہا ہے جس میں ہر ایک بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے' بجائے اس کے کہ کسی مسئلے پر پہلے تیاری کر کے کوئی بات کی جائے' کوئی سوچ بچار ہو یا تاریخ سے سبق حاصل کیا جائے۔ لگتا ہے ہماری پوری قیادت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہے جس کے جو جی میں آتا ہے کہتا پھرتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد اسمبلی سیٹوں کے کبھی متمنی نہیں رہے۔ انتخابی سیاست سے وہ کوسوں دور ہیں' کسی بھی قومی مسئلے پر ان کا موقف ووٹ بنک سے بے نیاز ہوتا ہے۔ نہ ہی ان کے کوئی ذاتی یا جماعتی مفادات ہیں جو صحیح بات کہنے میں مانع ہوں۔ اصغر خان کو جتنی سیٹیں ملتی ہیں وہ نہ بھی ہوں تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ان کے پیش نظر ووٹروں کی خوشنودی یا سستی شہرت کا حصول نہیں ہوتا۔ باقی تو معلوم ہوتا ہے کہ سب ہی اپنے جھوٹے وقار اور نمود و نمائش کی خاطر بیان بازی کر رہے ہیں۔

آئین میں ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی بات کہی گئی ہے نہ کہ صوبوں کی' جن کی تشکیل انگریز نے انتظامی سہولت کی غرض سے کی تھی۔ کوئی ذمہ دار شخص ایک نازک قومی مسئلے سے یہ کہہ کر چشم پوشی اختیار نہیں کر سکتا کہ اسے حل کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک پنڈورا بکس کھل جائے گا۔ پانچواں صوبہ نہ بنانے کی قسم کھالینا' سندھو دیش یا سندھ کے بھارت سے الحاق کی باتیں کرنا نا سمجھی' پاگل پن اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔

ہم روزانہ بوسنیا ہرزیگوینا میں مسلمانوں پر مظالم کی خبریں سنتے ہیں۔ چند سال قبل تک دنیا اس نام کے کسی علاقے سے واقف نہ تھی۔ یوگوسلاویہ چھ حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک حصے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' جس سے عیسائی دنیا غضب ناک ہو کر بھڑک اٹھی ہے اور سرب عیسائی جنہیں یورپ کی درپردہ حمایت حاصل ہے اس علاقے سے مسلمانوں کا صفایا کر رہے ہیں۔ سیاسی پنڈتوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ماسکو میں قائم مضبوط مرکز آناً فاناً بکھر کر رہ جائے گا اور اسلحہ کے ڈھیر دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ وہاں کوئی لوگوں کے حقوق کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ چیکو سلواکیہ دو الگ ممالک' چیکس اور سلواکیہ میں تقسیم ہو چکا ہے۔ برطانیہ کے ذرائع ابلاغ میں ابھی سے یہ بحث شروع ہو گئی ہے کہ آیا رواں صدی کے اختتام تک برطانیہ عظمیٰ ایک ملک کے طور پر قائم رہ سکے گا یا اس کے چار حصے انگلینڈ' سکاٹ لینڈ' آئرلینڈ اور ویلز ہوں گے۔ اور اگر ایسا ہو تو ان کے درمیان روابط قائم کرنے کی کیا شکل ہو سکتی ہے تاکہ برطانیہ کی معاشی برتری اور "سات بڑوں" میں اس کی حیثیت مجروح نہ ہو!

پاکستان کے کوئی بھی ٹکڑے نہیں چاہتا۔ لیکن اس میں ۶' ۸ یا ۱۰ صوبے بنانا قطعاً کوئی غداری یا ملک دشمنی نہیں۔ اگر یہ کام سلیقے' لوگوں کی رضامندی اور دانش مندانہ طریقے سے انجام دیا جائے تو کوئی پنڈورا بکس نہیں کھلے گا۔ بلکہ لاکھوں' کروڑوں انسانوں کو جن کے حقوق ناجائز طور پر غصب کر لئے گئے ہیں' سکھ کا سانس لینے کا موقع ملے گا۔ اس کا طریقہ کار اگر جاننا ہو تو اپنے ہمسایہ ملک پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ مانا کہ بھارت کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر ہمارا جھگڑا چل رہا ہے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ضدم ضدا میں اپنا کباڑا کر لیا جائے اور محض اس لئے صحیح رخ پر اقدام نہ کیا جائے کہ اس طرح ہمیں بھارت کی پیروی کرنے کا طعنہ ملے گا۔

ہندوستان کی تقسیم کے چند سال بعد چوہدری محمد علی نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ بھارت جلد ہی ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ یہ ان کی کوئی آرزو نہیں تھی بلکہ بھارت میں موجود مختلف نسلی گروہوں کی آپس کی دشمنی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ بات کہی تھی اس بات کو لگ بھگ نصف صدی ہونے کو ہے مگر بھارت الٹا مضبوط ہوا ہے۔ وجہ کیا ہے؟

۳۱/دسمبر ۱۹۲۹ء کو پنڈت نہرو کی صدارت میں کانگرس کا سالانہ اجتماع ہو رہا تھا جس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ جونہی ہندوستان آزاد ہوا ہم انگریز کے بنائے ہوئے صوبے بدل دیں گے۔ اس لئے کہ انگریز نے یہ سرحدیں اپنی سہولت کے لئے مقرر کر رکھی ہیں نہ کہ ہمارے لئے۔ آزادی کے بعد اگرچہ تلگو بولنے والے مدارس پریذیڈنسی سے اپنا الگ صوبہ چاہتے تھے مگر پنڈت نہرو اپنا وہ وعدہ بھول گئے اور بالآخر مجبور ہو کر ۱۹۵۳ء میں تلگو کانگرسی لیڈر' سری رامولو کو' جن

کی عمر اس وقت اسی برس تھی' الگ اندھرا صوبے کے لئے مرن برت رکھنا پڑا اور اس میں انہوں نے اپنی جان دے دی۔ اس پر تلگو عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور ریاستی حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ پنڈت نہرو نے اس جمہوری مطالبے پر عوام کے خلاف بارڈر سیکورٹی فورس یا فوج استعمال کرنے کی بجائے صوبہ مدراس کے تلگو بولنے والے اکثریتی اضلاع پر مشتمل الگ صوبے کا اعلان کر دیا جسے بعد میں لوک سبھا کی منظوری حاصل ہونا تھی۔ تب تک ملکی یک جہتی کے لئے صوبوں کی نئے سرے سے تشکیل ایک ناگزیر ضرورت بن چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے جسٹس فضل حسین کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے ججوں پر مشتمل سہ رکنی کمیشن قائم کر دیا جسے دو سال میں اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ کمیشن نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ مختلف مکاتب فکر اور گوشہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد سے بات کرنے کے بعد چودہ صوبے بنانے کی سفارش کی۔ بھارت کی حکومت نے ۱۹۵۶ء میں ان سفارشات کو منظور کر لیا اور فروری ۱۹۵۷ء میں عام انتخابات نئی تشکیل شدہ ریاستوں کی بنیاد پر ہوئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بغیر کسی ہنگامے' کشیدگی اور خون ریزی کے ضرورت کے تحت نئی ریاستیں بنتی رہی ہیں۔ جنوب میں جہاں پہلی مرتبہ آندھرا ریاست کا مطالبہ سامنے آیا تھا اب چار ریاستیں بن چکی ہیں۔ سابقہ مدارس پریذیڈنسی سمیت ٹراونکور' کوچیں اور میسور اور حیدر آباد کی سابقہ ریاستوں کے کچھ حصوں پر مشتمل اب آندھرا' تامل ناڈو' کرناٹکا اور کرالا کی ریاستیں ہیں۔ آندھرا میں تلگو دسام' تامل ناڈو میں دریو دا منیرا کاژغم' کرناٹکا میں جنتا اور اور کرالا میں کیمونسٹوں کی حکومتیں ہیں۔ مرکز میں برسر اقتدار کانگرس (آئی) نہ تو ان صوبوں میں اپنی حکومت بنانے کے لئے ہارس ٹریڈنگ کا سہارا تلاش کرتی ہے نہ ہی وزیر اعظم نرسمار اؤ کو یہ پریشانی لاحق رہتی ہے کہ حیدر آباد' مدراس' بنگلور یا ٹراونکور پر اقتدار کے بغیر وفاق کی پالیسیاں کیوں کر روبہ عمل لائی جائیں۔ تقسیم کے وقت بھارت کے پاس چھ مکمل صوبے متحدہ صوبہ جات' وسطی صوبہ جات' بہار' بمبئی' مدراس اوڑیسہ اور تین منقسم صوبے' مغربی بنگال' مشرقی پنجاب اور آسام تھے۔ اب ۲۶ ریاستیں اور سات مرکز کے زیر انتظام علاقے ہیں' دو مزید ریاستوں کا اضافہ مستقبل قریب کی بات ہے۔ اتر پردیش کے آٹھ پہاڑی اضلاع پر مشتمل اتر کھنڈ کا قیام تو تقریباً یقینی ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی سفارش خود اتر پردیش کی اسمبلی نے کی ہے۔ بہار کو کاٹ کر جھار کھنڈ کی ریاست بنانے پر بھی غور ہو رہا ہے۔

بھارتی ریاستیں پوری طرح خود مختار ہیں۔ پاسپورٹ پر اگرچہ گورنمنٹ آف انڈیا کا نشان ہوتا ہے مگر اسے ریاستیں اپنی مہر کے ساتھ جاری کرتی ہیں۔ ایک ریاست سے دوسری ریاست کو مال و حرفت کی نقل و حرکت بین الریاستی لیٹر آف کریڈٹ کے ذریعے عمل میں آتی ہے ریاستوں کو بین الاقوامی تجارت کا اختیار ہے کسی بھی بیرونی ملک کے ساتھ تجارتی معاہدہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح ایک ریاست بیرونی سرمایہ کاروں کو اپنے ہاں مدعو کر سکتی ہے۔ اپریل ۱۹۹۵ء میں لندن کی ایک میٹنگ میں سو کے قریب مسلمان سرمایہ کار موجود تھے۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ' ملائم سنگھ یادو نے انہیں اپنے ہاں سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر میں بی جے پی۔ شیو سینا دونوں سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں' ان کے مقابلے میں اعتدال پسند ہندو موجود ہیں۔ حال ہی میں بھارتی آئین میں ترمیم کر کے دو جنوبی ریاستوں' تامل ناڈو اور کرناٹکا میں پس ماندہ طبقات یعنی شیڈولڈ کاسٹس' دلیتس اور مسلمانوں کے لئے تعلیمی اداروں اور گورنمنٹ ملازمتوں میں ۶۹ فیصد کوٹہ مقرر کیا گیا ہے اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور سپیریر انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحانات میں اردو میں بھی جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ کیا ان باتوں سے بھارت الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے؟ اس کے برعکس بھارت مضبوط ہوا ہے اس لئے کہ وہاں لوگوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ حکومت' انتظامیہ اور معاشی ترقی یہاں تک کہ ملک کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں ہے۔

ستر کی دہائی میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ پاکستان کا قیام صوبوں کا مرہون منت ہے یا صوبے پاکستان کے رہین منت ہیں۔ اور یہ بات حتمی اور قطعی تھی کہ اصل اہمیت پاکستان کی ہے' صوبوں کو ثانوی درجہ حاصل ہے صوبوں کی سرحدیں کوئی آسمان سے نازل نہیں ہوئیں۔ انہیں بڑا کیا جا سکتا ہے' جیسا کہ ون یونٹ کی صورت میں کیا گیا اور چھوٹا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ یحییٰ خان نے ون یونٹ کو توڑ کر کر دیا۔ آئین آسمان صحیفے نہیں ہوتے' ان میں کمی بیشی' ترامیم اور نظر ثانی کا امکان موجود رہتا ہے۔

ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے مضبوط مرکز کے کھوکھلے نعرے خود غرضی اور سازشی ذہنیت کا مظہر ہیں۔ ہمارے زعماء کی چاپلوسی' ہٹ دھرمی اور لوٹ مار کیا رنگ لائے گی اس کا سوچ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔ بلوچستان کے تین وسیع و عریض اضلاع میں پختون اکثریت میں ہیں اور بلوچوں کے ساتھ ان کی اکثر کشمکش رہتی ہے۔ سرائیکی بولنے والوں کو رام کرنے کے لئے سپیکرشپ اور صدارت ہم نے وہاں کے جاگیرداروں کو الاٹ کر رکھی ہے پنجاب پی۔ ڈی۔ ایف میں حالیہ اختلافات کے دوران پی۔ پی کے وزیر اعلیٰ کے لئے جو نام تجویز کیا گیا تھا اس کا تعلق جنوبی پنجاب سے تھا جو سرائیکی والوں کی دلجوئی کا ہی ایک حربہ تھا۔ ہندکو اور پوٹھوہاری عوام اپنی پہچان بنانے کے لئے الگ بے چین ہیں۔ پاکستان کی کل آبادی کے ۱۵ فیصد پر مشتمل سندھ کی شہری آبادی کا وفاقی ملازمتوں میں حصہ صرف ایک فیصد ہے۔ کوٹہ سسٹم نے صوبے کے اندر بھی اس کا حصہ کم کر کے ۴۰ فیصد کر دیا ہے حالانکہ اگر صحیح رائے شماری کرائی جائے تو سندھی وڈیروں کی نیند حرام ہو جائے۔ مگر سندھ کی شہری آبادی کا صوبائی ملازمتوں میں اصل حصہ ۱۵ فیصد سے زائد نہیں تمام چوٹی کی آسامیاں دیہی سندھ کے پاس چلی جاتی ہیں۔ اس کا مشاہدہ تغلق ہاؤس اور سندھ سیکرٹریٹ جا کر کیا جا سکتا ہے۔ ایک انتہائی ناقابل اعتبار ڈھانچے کو برقرار رکھنے پر اڑے رہنا ملک کے مفاد میں نہیں ہو سکتا۔ موجودہ صوبائی حدود کو دوام بخشنے کی کوئی کوشش بھی بار آور ثابت نہیں ہو گی۔ فوج اور رینجرز کو بھیج کر کسی علاقے کے حقوق دبانے سے اسلام آباد میں مقیم حکمران کچھ مہلت تو حاصل کر لیں گے مگر یہ کام ملک کے لئے تباہ کن ہو گا' کراچی میں رہنے والے لاکھوں کی تعداد میں روزگار کے لئے دھکے کھاتے پھر رہے ہوں' جن میں آدھے تعلیم یافتہ ہیں' ان پر آپ صوبہ سرحد سے ۵ ہزار ریٹائرڈ ملازمین لا کر مسلط کر دیں گے تو کیا نتیجہ بر آمد ہو گا! قومی وحدت کا حصول کراچی والوں کو ہراساں کرنے سے ہرگز ممکن نہ ہو گا۔

ہماری اس طرح کی حرکتوں کی وجہ سے آج تک پاکستان عدم استحکام کا شکار ہے! لیکن کیا ہم نے راہ راست پر نہ آنے کا تہیہ کر رکھا ہے ہر دیانت دار پاکستانی شہری کا فرض ہے کہ اب بھی ملکی سلامتی کی فکر کرے۔ خاص کر ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کو چاہئے کہ وہ سپریم کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک کمیشن کے فوری قیام کا مطالبہ کرے جو دو سال کے اندر صوبوں

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

احیائے اسلام کی ایک کوشش "تحریک مجاہدین علی گڑھ" کے حوالے سے

# ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم سے ایک ادھوری ملاقات!

## وہ آخری سانسوں تک پرورش لوح و قلم میں مصروف رہے

نثار احمد ملک

۱۴/ جولائی کو آسمان علم کا ایک درخشندہ ستارہ ثلث صدی تک علم و حکمت کی ضیاء پاشیوں کے بعد خاموشی کے ساتھ غروب ہو گیا۔ میری مراد معروف دینی اسکالر اور مسلمان فلسفی پروفیسر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ۱۹۰۴ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے فلسفہ کیا اور ۱۹۴۰ء میں مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ "وحدت الشہود" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ تک علی گڑھ میں پڑھاتے رہے۔ تحریک پاکستان کے فکری محاذ پر کام کیا۔ جب لاکھوں عصمتوں کی نیلامی اور لاکھوں جوانیوں کی قربانی کے بعد برعظیم کے عظیم مسلمان فلسفی علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر پاکستان کی شکل میں معرض وجود میں آئی تو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی بھی قائداعظم مرحوم کے کہنے پر پاکستان تشریف لے آئے۔ پاکستان آنے کے بعد وہ وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی بنے لیکن یہ کونسل کام نہ کر سکی۔ صدر ایوب کے دور میں انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی کی پیشکش کی گئی جو انہوں نے بوجوہ ٹھکرا دی۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی شہرت فلسفہ کے ایک استاد اور دینی اسکالر کی حیثیت سے تھی۔ وہ مشہور مسلمان فلسفی پروفیسر ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو اپنے اس لائق شاگرد پر بجا طور پر فخر تھا۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے بھرپور علمی زندگی گزاری۔ وہ علمی محافل کی جان ہوا کرتے تھے۔ ان کی کئی ایک تصانیف طبع ہو چکی ہیں اور سینکڑوں مضامین مختلف علمی جرائد میں شائع ہوئے۔ ملک میں ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے پاکستان کی نسل نو اپنے محسنوں سے یکسر ناواقف ہے۔ اقتدار میں ایسی انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں کہ ناچنے گانے والے معزز ٹھہرے ہیں اور اہل علم و دانش ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کسمپرسی کی حالت میں دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے زندگی درویشانہ انداز میں گزاری لیکن ان کی موت بھی انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ہوئی ہے۔ اگر وہ چاہتے کہ دولت دنیا اکٹھی کریں تو ان کے لئے بھی یہ ممکن تھا لیکن وہ لوح و قلم کی عصمت کی حفاظت میں عمر بھر مصروف رہے۔ وہ علم و حکمت کی آبیاری کی دھن میں مگن رہے اور اسی دھن میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ انتہائی خاموشی سے عالم فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کر گئے۔ ۱۵ جولائی کے اخبارات میں دوسرے صفحے پر ایک کالمی خبر لگائی گئی کہ "ڈاکٹر برہان احمد فاروقی رحلت فرما گئے ہیں"۔ چند برس قبل راقم نے معروف ادیب اور کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی کے ایک کالم میں، جو غالباً "نوائے وقت" میں چھپا تھا، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے بارے میں یہ الفاظ پڑھے تھے کہ "ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اپنے کاندھوں پر اپنے علم کا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں لیکن انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں"۔ ان کی یہ بات صد فی صد درست تھی۔ اس لئے کہ راقم ڈاکٹر فاروقی مرحوم کو ان کی وفات سے دو ماہ قبل انتہائی اذیت ناک حالت میں دیکھ کر آیا ہے۔

راقم کی ڈاکٹر فاروقی سے یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ یہ ملاقات ۱۸ مئی بروز جمعرات کو ان کے گھر پر ہوئی۔ میرے ساتھ محترم ڈاکٹر ابصار احمد اور برادرم حافظ عاکف سعید صاحب بھی تھے۔ ان سے اس ملاقات کا ایک پس منظر بھی ہے۔ ہم نے یہ ملاقات ان کی ایک حال ہی میں طبع ہونے والی کتاب "مسلمانوں کا سیاسی نصب العین اور علامہ اقبال" سے اپنی دلچسپی اور اس کتاب کے حوالے سے کچھ مزید معلومات کے حصول کے لئے کی تھی۔ اس کتاب میں

> "افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان کے سینکڑوں شاگرد، جن میں سے ایسے بھی ہیں کہ جو ان کے نام سے تحریکیں اور جماعتیں چلا رہے ہیں، اور شرق و غرب کے دورے کرتے ہیں، وہ بھی اپنے عظیم استاد کی دیکھ بھال نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ ان کے لئے کوئی ایسی مشکل بات نہ تھی!"

انہوں نے "تحریک مجاہدین علی گڑھ" کا تذکرہ کیا جو ان کے استاد ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم نے بنائی تھی۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن علامہ اقبال کے ہمعصر تھے۔ علامہ اقبال نے علی گڑھ یونیورسٹی میں انہی کے زیر صدارت اپنے معروف لیکچر دیئے تھے۔ معروف مسلم مفکر و فلسفی ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم بھی ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے شاگرد تھے اور انہی کی زیر سرپرستی اپنا پی ایچ ڈی مکمل کیا تھا۔ ڈاکٹر ظفر الحسن مرحوم نے مذکورہ بالا تحریک کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ سے خط و کتابت بھی کی جو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی اس کتاب میں شائع کر دی گئی ہے۔ نیز جب ڈاکٹر سید ظفر الحسن افغانستان سے واپس ہوئے تو لاہور میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ سے ملاقات بھی کی۔ علامہ اقبالؒ نے انہیں اپنے خطوط

اور ملاقات میں کامل تائید کی یقین دہانی کرائی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اس "تحریک مجاہدین علی گڑھ" کے لئے بہت کام کیا۔ وہ اس کے اساسی ارکان میں سے تھے' نیز ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے نمائندے کی حیثیت سے علامہ اقبالؒ سے بھی ملاقاتیں کی۔

ہمیں اس کتاب اور تحریک سے دلچسپی اس لئے تھی کہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ ٹھیٹھ اسلامی اصولی انقلابی جماعت کا سا تھا۔ باقاعدہ بیعت کا نظام قائم کیا گیا اور امیر تحریک کو مکمل اختیارات حاصل تھے۔

یہاں میں اس بات کا ذکر کرتا چلوں کہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سے ملاقات کے چند روز بعد ہم تینوں حضرات مکتبہ کاروان کے مالک جناب چودھری عبدالحمید صاحب سے بھی ملے جو اس تحریک کے اساسی ارکان میں سے تھے اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بھی ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ اس تحریک کی داغ بیل بھی انہی دنوں ڈالی گئی۔ چودھری صاحب نے جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ سے بھی کئی بار ملے لیکن طبقہ علماء سے جب انہیں کوئی ایسا شخص اس کام کے لئے آمادہ نظر نہ آیا تو خود ہی اس کام کا بیڑا اٹھایا۔

اب میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم سے ہونے والی گفتگو کی طرف آتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ملاقات محترم پروفیسر ڈاکٹر ابصار احمد اور برادرم حافظ عاکف سعید صاحب کی معیت میں ہوئی ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ محترم ڈاکٹر ابصار احمد کی ڈاکٹر فاروقی صاحب سے بہت پرانی شناسائی ہے۔ ڈاکٹر ابصار احمد کے بقول ۱۹۷۶ء میں جبکہ وہ اپنے بڑے بھائی جناب اظہار احمد قریشی کے ساتھ ریواز گارڈن میں واقع ایک مکان میں مقیم تھے' ان دنوں ڈاکٹر فاروقی صاحب ان کی درخواست پر ہفتے میں دو تین دن ان کے ہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ ان دنوں محترم ڈاکٹر ابصار احمد' امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے وقیع مضمون "اسلام کی نشاۃ ثانیہ' کرنے کا اصل کام" کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب ان کے کئے ہوئے ترجمہ کی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ابصار احمد ان محافل کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب ۸۱ء میں ڈاکٹر ابصار احمد جامعہ پنجاب میں شعبہ فلاسفی کے سربراہ تھے تو انہوں نے ڈاکٹر فاروقی صاحب کا اقبال میموریل لیکچر بھی رکھوایا تھا جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اس کے علاوہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی قرآنی کانفرنسوں اور محاضرات قرآنی میں بھی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم بارہا تشریف لائے۔

محترم ڈاکٹر ابصار احمد سے ان کی اس طویل شناسائی کا پس منظر بیان کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ جب ہم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سے ملاقات کے لئے گئے تھے تو وہ بیماری کی اس کیفیت میں مبتلا تھے کہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کو بھی نہیں پہچان سکے۔ ہمیں ان کے کبر سنی کا تو علم تھا لیکن ان کی بیماری کا قطعاً علم نہ تھا۔ جناب ڈاکٹر ابصار احمد کو اپنا تعارف کرانے میں خاصی دقت پیش آئی۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم سے ہونے والی مختصر سی ملاقات میں ان سے جو ہماری گفتگو ہوئی ہم نے اسے ریکارڈ بھی کر لیا تھا اور راقم نے کچھ نوٹس بھی لے لئے تھے۔ میں نے اسی رات اس گفتگو کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ ان سے یہ ادھوری سی ملاقات آخری ثابت ہو گی۔ اگرچہ محترم ڈاکٹر فاروقی صاحب نے کہا تھا کہ آپ لوگ کبھی نماز فجر کے بعد تشریف لائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ فجر کے بعد ان کی طبیعت میں مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے زیادہ آمادہ ہوتی ہے۔ افسوس کہ ہم دوبارہ نہ جا سکے۔ ان سطور کا راقم کئی بار محترم ڈاکٹر ابصار احمد کو کہتا بھی رہا لیکن وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے وقت نہ نکال سکے۔ اس طرح ان سے دوبارہ ملنے کی ہماری خواہش تشنہ تکمیل رہی۔

اب میں ڈاکٹر فاروقی سے ہونے والی گفتگو کو قارئین کے سامنے رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر ابصار احمد نے اپنا اور ہمارا تعارف کرانے کے بعد سوال کیا کہ آج کل کس ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں۔ جواباً ڈاکٹر فاروقی نے انتہائی حسرت آمیز لہجے میں کہا کہ "میرا علاج کون کرائے گا!!" ڈاکٹر ابصار احمد نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہم آپ سے آپ کی نئی کتاب کے حوالے سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے "کون سی کتاب"۔ گویا انہیں اپنی کتاب کے چھپنے کا علم تک نہ تھا۔ ڈاکٹر ابصار احمد نے وہ کتاب دکھائی تو انہیں علم ہوا۔ ڈاکٹر ابصار احمد نے سوال کیا کہ "اس کتاب کے آپ ہی مصنف ہیں نا؟" کہنے لگے "مصنف نہیں' قصوروار ہوں!!" ڈاکٹر ابصار احمد نے پوچھا کہ "یہ عنوان آپ نے ہی تجویز کیا ہے یا آپ کے ناشر چودھری مظفر حسین صاحب نے؟" کہنے لگے "کوئی کتاب بغیر نام کے کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ نام میں نے ہی دیا ہے" محترم ڈاکٹر ابصار احمد نے سوال کیا کہ "یہ آپ کی نئی کتاب ہے؟" "نہیں بہت پہلے لکھی تھی"۔

ڈاکٹر ابصار احمد نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "آپ کے ناشر چودھری مظفر حسین صاحب آپ سے ملتے رہتے ہیں" فرمانے لگے "ہاں رابطہ ہے"۔ "کیا ہفتے میں ملاقات ہوتی ہے یا مہینے کے بعد؟"

**"پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب بھی تو آپ کے شاگرد رہے ہیں اور آپ کی کتاب "منہاج القرآن" سے اپنے ادارے اور تحریک کا نام اخذ کیا ہے' آپ کیا فرمائیں گے' کیا وہ آپ کے افکار کے صحیح ترجمان اور شارح ہیں؟" اس پر کہنے لگے کہ "وہ میرا شاگرد ہے لیکن وہ میری بات سمجھا نہیں ہے"**

مزید انکشاف یہ کیا کہ اس تنظیم کا باقاعدہ ایک عہد نامہ رفاقت تھا جس کا ہر روز کسی نماز کے بعد اراکین باقاعدہ مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے پاس وہ "عہد نامہ" اب بھی موجود ہے۔ چودھری صاحب نے اس "عہد نامہ" کی ایک کاپی ہمیں دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی لیکن دوبارہ ان سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ چودھری صاحب کا کہنا تھا کہ یہ خفیہ تحریک تھی۔ اس کے پیش نظر مقاصد میں مسلمانوں کی آزادی اور اقبال و عروج تھا۔ چودھری عبدالحمید صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہمیں باقاعدہ فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ لاٹھی چلانے کا ایک کھیل باقاعدہ سکھایا جاتا تھا جسے "بے نوٹ" کہا جاتا ہے۔ چودھری عبدالحمید صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر سید ظفرالحسن مرحوم کے ذہن میں اسلام کے احیاء کے لئے' جس طرح کی جماعت کی ضرورت کا احساس تھا' وہ اپنے آپ کو ایک طویل عرصہ تک اس کا اہل نہ سمجھتے ہوئے کسی دوسری شخصیت کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ علامہ اقبالؒ کے علاوہ پیر سید

جواب دیا کہ "نہیں دو تین ماہ کے بعد کبھی آتے ہیں" راقم نے سوال کیا کہ "ڈاکٹر صاحب اس کتاب میں مجوزہ جماعت کے ارکان کے لئے کہا گیا ہے کہ ان کا تعلق علی گڑھ سے ہو گا' اس کی کوئی خاص وجہ؟" جواباً گویا ہوئے کہ "یہ جماعت نہیں بلکہ نظریاتی گروپ تھا اور علی گڑھ والے مخاطب اول تھے ورنہ اس کو پورے ہندوستان میں پھیلانا پیش نظر تھا" میں نے سوال کیا کہ "یہ سکیم کیوں ناکام ہو گئی؟" فرمانے لگے "لوگ نہیں آئے" راقم نے پھر سوال کیا کہ "آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے کوئی خفیہ تنظیم بنانا پیش نظر تھا" کہنے لگے "نہیں ایسی کوئی بات نہ تھی" ان کے اس جواب پر راقم نے ان کی کتاب کے متعلقہ حصے کی چند لائنیں پڑھ کر سنائیں۔ اس پر کہنے لگے کہ "اس وقت کے حالات ہی ایسے تھے کہ کسی قدر اخفا ضروری تھا"۔

جناب ڈاکٹر ابصار احمد نے سوال کیا کہ "یہ لوگ کتنے عرصہ تک جڑے رہے؟" اس پر نہ جانے کیوں محترم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کے لہجے میں کسی قدر تلخی پیدا ہو گئی۔ کہنے لگے "حالات کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہئے' دوسروں کی رائے سے نہیں" راقم نے سوال کیا کہ "اس مجوزہ تنظیم' جماعت یا نظریاتی گروپ کا جو تنظیمی ڈھانچہ بنایا گیا ہے وہ بیعت کے نظام پر ہے جبکہ علی گڑھ کے لوگوں کو بہت ہی لبرل سمجھا جاتا ہے' تو ایسے کیوں تھا؟" میرے سوال پر ڈاکٹر ابصار احمد نے یہ اضافہ کیا کہ "جماعت اسلامی نے بھی دستوری اور جمہوری ڈھانچہ ہی اپنا رکھا ہے!" ڈاکٹر فاروقی صاحب فرمانے لگے کہ "یہ لوگ مغرب سے مرعوب ہیں" میں نے سوال کیا کہ "بعض لوگ اسے (بیعت اور تاحیات امارت) غیر اسلامی بھی کہتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں' آپ کی ان لوگوں کے بارے میں رائے کیا ہے!" جواباً ارشاد فرمایا "یہ لوگ کام نہیں کرنا چاہتے"۔

گفتگو جاری رکھتے ہوئے جناب ڈاکٹر ابصار احمد نے سوال کیا کہ "مجوزہ جماعت مسلم لیگ سے ہٹ کر تھی' کیا اس کے مقاصد وہ نہ تھے جو مسلم لیگ کے تھے' مطلب یہ ہے کہ مسلم لیگ کی موجودگی میں ایک الگ گروپ تشکیل دینے کی ضرورت؟" انہوں نے سوال کیا کہ "مسلم لیگ کے مقاصد کیا تھے؟" ابصار صاحب نے کہا کہ "حصول آزادی وطن" اس پر فاروقی صاحب نے کہا کہ "ظاہر ہے آزادی کے بغیر تو یہ مقصد (یعنی احیائے اسلام) پورا ہو ہی نہیں سکتا"۔

آپ نے فاروقی صاحب کے جوابات سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ وہ نقاہت اور بیماری کی وجہ سے ہم سے تفصیلی گفتگو نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ ہر بات کا جواب ایک جملے میں دیتے تھے' پھر خاموش ہو جاتے۔ لہٰذا ہماری ٹیم نے بھی مناسب نہ سمجھا کہ ان کی بیماری کی اس کیفیت میں اس اہم موضوع پر مزید گفتگو جاری رکھی جائے۔ آخر میں چند سوالات اس مذکورہ کتاب سے ہٹ کر بھی کئے گئے۔ مثلاً برادرم حافظ عاکف سعید صاحب نے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب آپ کو کسی بھی قسم کی مدد کی' مثلاً ڈاکٹر کے پاس جانا ہو یا ڈاکٹر کو بلانا ہو یا علاج معالجے کے لئے رقم کی ضرورت ہو تو حکم دیں' ہم حاضر ہیں؟" کہنے لگے "جتنے پیسے ضرورت ہوتے ہیں' اللہ دے دیتا ہے۔ اس طرح کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے"۔ میں نے کہا کہ "ہم اپنے لئے سعادت سمجھ کر کچھ کرنا چاہیں تو؟" اس کو بھی ڈاکٹر صاحب نے رد کر دیا اور کہا کہ "بس دعا کیا کریں"۔

محترم ڈاکٹر ابصار احمد نے کہا کہ "اسرار بھائی سلام کہہ رہے تھے" اس پر فاروقی صاحب بہت خوش ہوئے۔ ڈاکٹر ابصار احمد نے عاکف صاحب کا مزید تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے فرزند ہیں۔ اس پر کہنے لگے کہ "آپ لوگ آتے نہیں ہیں تو میں کیسے پہچانوں گا"۔ ڈاکٹر ابصار احمد نے سوال کیا کہ "پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب بھی تو آپ کے شاگرد رہے ہیں اور آپ کی کتاب "منہاج القرآن" سے اپنے ادارے اور تحریک کا نام اخذ کیا ہے' آپ کیا فرمائیں گے' کیا وہ آپ کے افکار کے صحیح ترجمان اور شارح ہیں؟" اس پر کہنے لگے کہ "وہ میرا شاگرد ہے لیکن وہ میری بات سمجھا نہیں ہے"۔ میں نے سوال کیا کہ "ان کی تحریک کا نام تو آپ کی کتاب سے ہی ماخوذ ہے؟" کہنے لگے "کیا نام ہے؟" میں نے کہا "تحریک منہاج القرآن" اس پر فرمانے لگے "نام میں فرق نہیں پڑا؟" میں نے کہا "نہیں" کہنے لگے "نام دوبارہ بتاؤ؟" میں نے دوبارہ نام لیا کہ "تحریک منہاج القرآن" کہنے لگے "فرق ہے کہ نہیں؟" تب مجھے سمجھ آئی کہ وہ لفظ "تحریک" کے حوالے سے ہمیں یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ یہ اب بالکل الگ عنوان ہے جس کا ان کی کتاب سے کوئی تعلق نہیں!

یہ مختصر سی یادگار ملاقات تھی جو اپنے وقت کے عظیم مسلمان فلسفی سے ہوئی۔ دوران گفتگو ہم نے محسوس کیا کہ وہ اپنے استاذ محترم ڈاکٹر ظفر الحسن مرحوم سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ ان کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ "استاذ محترم" کہہ کر بات کرتے تھے۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی بے سروسامانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ حکومت وقت سے تو گلہ ہی کیا کہ اس کو "ثقافتی طائفوں" کو نوازنے سے فرصت ہی کب ہے کہ کسی صاحب علم' صاحب فکر شخصیت کی دیکھ بھال اور علاج معالجے پر توجہ دے سکے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان کے سینکڑوں شاگرد' جن میں سے ایسے بھی ہیں کہ جو ان کے نام سے تحریکیں اور جماعتیں چلا رہے ہیں' اور شرق و غرب کے دورے کرتے ہیں اور انتہائی پر تعیش زندگی گزارتے ہیں' وہ بھی اپنے عظیم استاد کی دیکھ بھال نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ ان کے لئے کوئی ایسی مشکل بات نہ تھی!

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی انتہائی بیماری کی حالت میں بھی توکل کا مجسمہ لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں زندگی کے پورے آثار نمایاں تھے۔ وہ اس حالت میں بھی بہت ہی پر اعتماد تھے۔ جب ڈاکٹر ابصار احمد نے ان کی جیب کے ساتھ لگے ہوئے قلم اور کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ابھی تک آپ اپنی جیب میں قلم قرطاس رکھے ہوئے ہیں؟" اس پر کہنے لگے کہ "اس لئے کہ میں ابھی لاش نہیں ہوں" ایسا شخص جو آخری لمحے تک پرورش لوح و قلم کرتا رہے' اس کی ایسی حسرت ناک موت' ہماری اقدار کی تبدیلی کا تعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

**"ڈاکٹر برہان احمد فاروقی جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے پاکستان کی نسل نو اپنے محسنوں سے یکسر ناواقف ہے۔ اقدار میں ایسی انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں کہ ناچنے گانے والے معزز ٹھہرے ہیں اور اہل علم و دانش ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کسمپرسی کی حالت میں دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں"**

# تشدد کی لہریں

## اسباب و علل اور ذمہ داریوں کا تعین

### تشدد کے روز افزوں رجحان پر اظہار تشویش پر مشتمل مدیر "ندائے خلافت" مرحوم اقتدار احمد کی آٹھ سال پرانی فکر انگیز تحریر' جو آج کے حالات پر بھی پورے طور پر منطبق ہوتی ہے

تشدد ہمارے روز مرہ کا حصہ اور تمدن کا نشان بنتا جا رہا ہے۔ آئے دن چونکا دینے اور لہو رلانے والی خبروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہم یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اپنی دینی اقدار سے ہی لاتعلق نہیں ہو چکا' اس زمانے میں تہذیب و شائستگی نے ملمع کا جیسا کچھ خول انسانیت پر چڑھا دیا ہے' اسے بھی اتار پھینکنے پر ہم ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ہم غول بیابانی ہیں' نظم و ضبط اور شرافت و نجابت اور شعور و احساس کے سب خصائل سے عاری۔ تعلیمی اداروں میں جاری و ساری تشدد کی لہریں' ملک و قوم کے لئے قیمتی اور اپنے والدین کے لئے سرمایہ حیات جانوں کا اتلاف' قتل و غارت گری کی بہیمانہ وارداتیں اور قانون شکنی کی عادت کی مظہر گھاتیں بھی ہمیں غور و فکر کی دعوت دینے میں ناکام رہیں تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔ اپنے معمولات میں سے ذرا وقت نکالئے اور سوچئے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ یہ طرز عمل' یہ طور طریقے ہمیں کہاں پہنچا کے چھوڑیں گے؟ انسان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ خالق نے پوری صراحت سے بتایا کہ تمہیں میں نے بہترین سانچے میں ڈھالا اور فطرت سلیمہ دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ پھر تم اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں گرنے پر آتے ہو تو پاتال کو چھو لیتے ہو' پستی کی کسی حد پر ٹھہرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ قاعدہ تو یہی ہے لیکن تھمی میں کچھ ایسے سعادت مند بھی پائے جاتے ہیں جو ایمان اور عمل صالح کے بل پر محض انسانیت کے شرف ہی کو قائم نہیں رکھتے' اس بلندی پر بھی جا پہنچتے ہیں جہاں سے نیچے کو جھانک کر دیکھتے ہیں کہ ع

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

مغرب والے' جن کی تہذیب و تمدن اور خوش حالی و خوش خصالی ہماری نظروں کو خیرہ کئے دیتی ہے' ایمان کی نعمت اور عمل صالح کی برکت سے محروم ہیں۔ لیکن انہوں نے بود و باش کے کچھ اصول' کچھ قرینے اپنی سہولت سے اور اپنی سمجھ کے مطابق وضع کر لئے۔ یہ اصول اور قرینے انہیں انسانیت کی اس معراج تک تو ہرگز نہیں پہنچاتے جسے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر ہم اپنی منزل قرار دے سکتے ہیں لیکن گزارا تو کر رہے ہیں۔ خود ساختہ اصولوں پر ہی سہی' عمل پیرا تو ہیں' ان کے قدم کسی نہ کسی نوع کی پستی پر آ کر جم تو گئے ہیں' آسمانی ہدایت سے بے نیاز ہیں لیکن زمین پر رہنے کے تو کچھ ضابطے بنا کر ان کی پابندی کرتے اور کراتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ۔ بلند بانگ دعویٰ ان سنہری اصولوں کی پاسداری کا جو وحی کے ذریعے دنیا کے سب سے سچے انسان ﷺ کو ملے اور بغیر ادنیٰ تغیر و تبدل ہم تک پہنچے لیکن نہ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ان پر عمل کا ارادہ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم پر عذاب الٰہی نفاق کی شکل میں مسلط ہو گیا ہے جس میں مبتلا شخص کی نشانیاں زبان رسالت مآب ﷺ سے یہ بیان ہوئی ہیں کہ جب بولے تو جھوٹ کہے' وعدہ کرے تو پورا نہ کرے' امین بنایا جائے تو خیانت پر اتر آئے اور کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو مرنے مارنے پر تل جائے۔ اس آئینہ میں ہم اپنی صورت دیکھیں تو بات صاف ہو جائے گی کہ ہمارے ہاں تشدد کی لہروں کا بنیادی سبب نفاق کی یہی بیماری ہے دوسری بہت بڑی وجہ اس غارت گر خرابی کی یہ ہے کہ معقولیت سے عار' ملک میں مروج قانون پر عدم اعتماد اور اس سے بھی بڑھ کر قانون نافذ کرنے والوں کی دیانت' فرض شناسی اور کارکردگی سے ہماری مایوسی اور بددلی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے جس کے بعد سلیقے قرینے' قواعد و ضوابط اور ان کی پاسداری حرف لایعنی ہو جاتی ہے۔ ٹریفک کے حادثات کے فوری رد عمل کے طور پر تشدد کا جو آغاز کراچی سے ہوا اور جس نے ہمیں کیا کیا برے دن دکھائے ہیں' اس کی وجوہات پر دفتر کے دفتر لکھے جا چکے لیکن کانٹے کی بات یہ ہے کہ لوگ برسہا برس سے سر کی آنکھوں دیکھتے چلے آ رہے تھے کہ سڑکوں پر بہہ جانے والا خون پانی سمجھ لیا جاتا ہے' لواحقین کی کہیں دادرسی نہیں ہوتی۔ قانون میں حادثے کے ذمہ دار فرد کے لئے تو ہلکی بھاری سزا ہے' اس باپ' ماں' بیوہ اور بچے کے لئے اشک شوئی اور حاجت روائی کا کوئی سامان نہیں جو احتیاج اور بے کسی کی سولی پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔ (قصاص و دیت کا قانون قیل و قال کا موضوع تو بنا' عمل درآمد کے کہیں آثار نہیں)۔ پولیس کے تشدد کا شکار بننے پر' دن دہاڑے ڈاکے پڑنے اور سینہ زوری والی چوریوں میں کسی گھر کے لٹ جانے پر لوگ جلوس کیوں نکالتے ہیں' مظاہرے کیوں کرتے ہیں' توڑ پھوڑ پر کیوں اتر آتے ہیں۔ محض اس لئے کہ شور و غوغا کے بغیر "قانون نافذ کرنے والے اداروں" کے کان پر

"اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہم یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اپنی دینی اقدار سے ہی لاتعلق نہیں ہو چکا' اس زمانے میں تہذیب و شائستگی نے ملمع کا جیسا کچھ خول انسانیت پر چڑھا دیا ہے' اسے بھی اتار پھینکنے پر ہم ادھار کھائے بیٹھے ہیں"

جوں نہیں رینگتی۔ ہر حادثہ اور ہر سانحہ پولیس والوں اور ایوان انصاف کے چوبداروں کے لئے الٹا کمائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان کی چاندی ہو جاتی ہے۔ کسی کی جان گئی' آپ کی ادا ٹھہری!۔ وہ ظالم کی جیب تو صاف کرتے ہی ہیں' مظلوم کا "بوجھ" بھی ہلکا کر دیتے ہیں ..... مسلمانوں کے دستوری اعتبار سے اسلامی ملک میں جہاں کا چپہ چپہ ان بزرگوں کے سجدوں سے منور ہے جنہوں نے اسلام کی باقیات کے تحفظ میں زندگیاں کھپا دیں اور جہاں کی مٹی میں اشک ہائے سحرگاہی کی خوشبو آج بھی مہکتی ہے' اسلامی قدروں اور دینی شعائر کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور مشرقی آداب و اخلاق کی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں۔ اقبال کے شاہیں بچوں کو تقدیر امم یہ بتائی جاتی ہے کہ طاؤس و رباب اول' شمشیر و سناں آخر تو اس پر اعتراض کرنے والے صرف معقولیت کا انداز ہی تو اختیار کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انہیں تو فی الحقیقت قانون کی بھی پشت پناہی حاصل ہونی چاہئے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ایک طرف ان پر الحاد' بے دینی اور لاحیت کی منظم طاقت جھپٹتی ہے تو دوسری طرف احتجاج ..... جو بعض شرپسندوں کے در آنے سے اکثر خود بھی تشدد پر اتر آتا ہے ..... کا جواب تشدد سے دیا جاتا ہے۔ "قانون نافذ کرنے والوں" کی نظر میں ظالم و مظلوم برابر ہو جاتے ہیں۔

اب تک جو کچھ ہم نے لکھا وہ بنیادی اسباب سے متعلق ہے اور سطح پر ہی تیرتا نظر آتا ہے' ذرا گہرائی میں جائیں تو وجوہات کی ان گنت تہیں شمار کی جا سکتی ہیں۔ تاہم اس بات پر وثوق اور یقین کا اظہار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ انہی کو دور کر دیا جائے تو بگڑی بڑی حد تک بن جائے گی ..... اور ان سے اغماض کی روش کو نبھاتے چلے جانا معاشرے میں جس افراتفری اور انارکی کے چلن کو رواج دے گی' اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

ان بنیادی اسباب میں سے پہلے سبب کو دور کرنا ایک طویل اور صبر آزما کام ہے۔ عوام و خواص کی اخلاقی تربیت اور ان میں خیر و شر کی دینی قدروں کا شعور بیدار کر کے قبول عام کی فضا پیدا کرنا آسان نہیں۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی لیکن اس کام کا آغاز تو کیا جا سکتا ہے۔ نفاق کے جس مرض نے چالیس سالوں میں ہمارے جسم و جاں میں جڑیں پکڑیں ہیں' اس کا علاج ہوتے ہوتے ہو گا لیکن کم از کم احساس زیاں تو عام کیا جائے۔ لوگوں کو صاف صاف بتایا تو جائے کہ اپنے اللہ سے کئے ہوئے وعدے بھلا کے اس دین کے عملی تقاضوں کو طاق نسیاں میں رکھ کر جس کے لئے گاہے گاہے گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے اپنے سینے بھی کھول دیتے ہو' تم اللہ تعالیٰ کے قانون مکافات کی زد میں ہو۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا' اپنے رب کے حضور صدق دل سے توبہ کرو۔ اس کی کتاب کی طرف رجوع کرو جس میں تمہارے ہر درد کا درماں اور ہر روگ کا علاج موجود ہے۔ دین سے لوگوں کی جذباتی وابستگی کو الٹے سیدھے راستوں پر ڈالنے اور ان سے ذاتی' وقتی اور ہنگامی فوائد حاصل کرنے کی رسم ترک کر کے ہمارے اکابرین کو' وہ مردان سیاست ہوں یا رجال دین ..... اسے صحیح رخ پر موڑنا ہو گا۔

دوسرے سبب کو دور کرنے کی فوری تدابیر کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ کوئی ایسا کام بھی نہیں جو نیک نیتی اور ارادے کی پختگی کے ساتھ شروع کیا جائے تو نتائج کے ظہور میں تاخیر ہو۔ اس کی طرف سے لاپرواہی تغافل مجرمانہ ہے اور ناقابل معافی بھی ..... سڑکوں' گلی کوچوں اور تعلیم گاہوں میں بہتا ہوا یہ خون رنگ لائے گا اور تشدد کی لہروں کے یہ دھچکے ہمارے معاشرے کی چولیں ہلا دیں گے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہوش کے ناخن لئے جائیں اور ہم سب ..... عوام و خواص' زیردست و زبردست' حاکم اور محکوم ..... جو ایک ہی کشتی میں سوار ہیں' شاعر مشرق کا یہ فتویٰ کان کھول کر سنیں کہ۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

(ماخوذ از ہفت روزہ "ندا" ۲۹ مارچ ۸۸ء)

## اپنوں ہی کے ہاتھوں مریں اپنے یہ ستم ہے

عمر برناوی

بہتا ہے لہو اپنی زمیں پر یہ الم ہے
اپنوں ہی کے ہاتھوں مریں اپنے یہ ستم ہے

اپنوں نے جنہیں قتل کیا اپنے شہر میں
یہ آنکھ مری ان ہی کے افسوس میں نم ہے

اغیار تو محفوظ ہیں ہر برق ستم سے
اے گردش دوراں ترا ہم پر ہی کرم ہے

سمجھتے ہیں شبستاں تو سمجھنے دو بلا سے
مجھ کو تو ان اجڑی ہوئی مانگوں کی قسم ہے

غالب تو پیا کرتے تھے مئے قرض کی لیکن
ہاتھوں میں درندوں کے یہاں خون کا جم ہے

انسان ہیں' مسلم ہیں' یہ بھائی ہیں ہمارے
کوئی بھی ہو پہچان مجھے سب ہی کا غم ہے

پھر آئے عمر کوئی یہاں عدل ہو قائم
لیلائے سیاست کی تو زلفوں میں بھی خم ہے

# مہاجروں کو علیحدہ صوبہ ملنا چاہئے .... نہیں ملنا چاہئے!!

## لسانی، صوبائی اور ثقافتی بنیادوں کو بالکلیہ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا

## اسلام ان عصبیتوں کو دینی عصبیت کے تابع دیکھنا چاہتا ہے

**کراچی سے ہمارے ایک قاری کے خط کے جواب میں تنظیم اسلامی کے بزرگ رفیق غوری صدیقی کی گزارشات**

قومی و ملی درد و تڑپ سے معمور ہمارے ایک قاری جناب محمد ریاض نے جن کا تعلق کراچی سے ہے، مسئلہ کراچی سے متعلق اپنے مافی الضمیر کو درج ذیل سوالات اور تجاویز میں بیان کیا ہے۔

1 کراچی، پاکستان کا دماغ اور سر ہے، اس کے بغیر پاکستان محض ایک دھڑ ہے، کسی طبقہ کے دباؤ کے تحت اگر آج اس کو الگ صوبہ بنا دیا گیا تو کل یہی طبقہ بزور بازو اس کو پاکستان سے الگ بھی کر سکتا ہے!۔

2 کراچی، پاکستان کے خزانہ میں تقریباً ۷۰% ٹیکس جمع کراتا ہے، جس پر پاکستان کا زیادہ تر انحصار ہے۔ اگر معاملات اسمبلیوں سے باہر طے ہونے کا اصول عمل میں آگیا تو یہ سلسلہ چل پڑے گا اور الگ صوبہ کی صورت میں یہ ٹیکس نیا صوبہ اپنی تحویل میں لے لے گا اور پاکستان افغانستان کی طرح پس ماندہ ملک بن کر رہ جائے گا۔ اگر اردو بولنے والے اپنا الگ صوبہ چاہتے ہیں تو ان کو صحرائے تھر کا علاقہ دے دیا جائے تاکہ وہ اسے تعمیر کریں۔ کراچی جو بنا بنایا اور ترقی یافتہ شہر ہے، اس کو ایک طبقہ کو صوبہ بنا کر دے دینا بقیہ پاکستانیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔

3 اگر کراچی کو الگ صوبہ بنانا ہی ہو تو موجودہ گھمبیر حالات میں نہیں بننا چاہئے کیونکہ مہاجر قومیت کا لسانی نعرہ بلند کر کے اپنوں کا ایک ٹولہ اغیار کی سازشوں کا آلہ کار بن چکا ہے۔ نظریہ پاکستان زندہ رہنا لازمی ہے اور ہمارا نظریہ مذہب سے منسلک ہے۔

4 کراچی میں کئی گروہ آباد ہیں مثلاً میمن اور پنجابی سوداگر برادری۔ ایم کیو ایم کے ساتھ زیادہ تر لوگ بہاری ہیں اور نوکری پیشہ ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت دفاتر میں ان کی اجارہ داری تھی جواب نہ رہی تو ان کو شکایات ہوئیں۔ ان کی ان جائز شکایات کو رفع کرنا حکومت کا فرض ہے مگر ان کے مطالبے پر نیا صوبہ بنانے سے دو نتیجے نکلیں گے۔

(i) اصولی اور نظریاتی طور پر زبان کو اساس قومیت تسلیم کرنا ہوگا۔

(ii) قدیم سندھی اسے ہرگز تسلیم نہیں کریں گے اور کشت و خون ہوگا۔

5 مکہ سے مسلمانوں کی ہجرت مدینہ، دوبارہ مکہ مکرمہ فتح کرنے کا پیش خیمہ تھی اور ہجرت اس وقت تک مکمل ہی نہیں تھی جب تک دوبارہ مکہ فتح کرنے کا عزم نہ ہوتا۔ لہٰذا مہاجرین کو پاکستان میں نیا صوبہ بنانے، بنوانے یا فرزند زمین بننے کی بجائے دوبارہ دہلی، کلکتہ اور حیدر آباد دکن حاصل کرنے کی سوچنا چاہئے۔

ذیل میں تنظیم اسلامی کے ایک بزرگ رفیق جناب محمد غوری صدیقی نے ان استفسارات کا جواب دیا ہے جو قارئین ندائے خلافت کے استفادے کے لئے شامل اشاعت کئے جا رہے ہیں۔

محترمی جناب محمد ریاض صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج گرامی

آپ نے اپنے خط میں اپنے خیالات کو جس طرح کھل کر بیان کیا ہے وہ یقیناً آپ کے قومی و ملی درد، تڑپ اور خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ بہرکیف اختلاف رائے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ اور تنظیم اسلامی پاکستان کا مجموعی موقف زیر بحث مسئلہ میں سامنے رکھتے ہوئے آپ کے خط کا جواب پیش خدمت ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ مسئلہ مشرقی پاکستان اور اب مسئلہ کراچی کی پیدائش کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان کی تحریک جس نعرے پر چلائی اور کامیاب بنائی گئی اس کو عملی شکل دینے میں ہم بری طرح ناکام رہے۔ اگر پاکستان کا مقصد وجود پورا ہو جاتا تو یہ قومی، علاقائی مسئلے اپنی اپنی حدود تک ہی مقید رہ کر بحیثیت مجموعی خیر کا سبب بنتے، جو اب حدود سے تجاوز کر کے مجسم شر کا روپ دھار چکے ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اسلام نے قومیتوں، قبائل اور ان کی عصبیتوں کی نفی نہیں کی بلکہ ان کے وجود کو Acknowledge کیا ہے۔ سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۳ میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ "اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں برادریوں اور قبائل میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سے فضیلت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے" عربی زبان میں "عصب" باندھنے والی شے کو کہتے ہیں۔ اسی لفظ سے عصبیت کا لفظ نکلا ہے جو کہ چھوٹے پیمانوں پر انسان کی جمعیتوں کو آپس میں باندھ کر مضبوط کرتی ہے۔ اسی سے لفظ اعصاب بنا ہے جو کہ پورے جسم کی مضبوطی کا باعث ہوتا ہے البتہ ان تمام عصبیتوں (قومی، خاندان، قبائلی، صوبائی، لسانی وغیرہ) پر بالاتر دینی عصبیت ہونی چاہئے اگر ایسا ہے تو ہر نوع کی عصبیت خیر کا موجب اور مطلوب ہے بصورت دیگر تمام عصبیتیں شر بن جاتی ہیں۔

تحریک پاکستان کے وقت پورے برعظیم ہند کے مسلمان جغرافیائی (یعنی صوبائی یا علاقائی) نسلی اور لسانی امتیازات (عصبیت) سے بالاتر ہو کر ایک خالص دینی

عصبیت کے مضبوط بندھن میں بندھ کر بنیان مرصوص بن گئے تھے لہٰذا سب کے لئے مجموعی خیر کی صورت میں پاکستان اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طریق پر عطا فرمادیا۔ بعد ازاں نظریہ پاکستان پر عملدرآمد میں لیت و لعل سے کام لیا گیا' نتیجتاً اس کوتاہی کی پاداش میں پاکستان کے مسلمان صوبائی' علاقائی' نسلی اور ثقافتی عصبیتوں کا شکار ہو کر مختلف قومیتوں میں تقسیم ہو گئے اور ان ہی بنیادوں پر مادی وسائل و منافع کی چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ اس طرح پہلے مشرقی پاکستان ان ہی مادہ پرستانہ عوامل محرومی کے احساس کی بنا پر منفی تحریک کا شکار ہوا اور اب کراچی میں اسی کیفیت کے ساتھ غلط انداز میں نپٹنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اگر پاکستان میں پنجابی' سندھی' بلوچی' اور پختون قومیتوں کا نعرہ لگنے کی بجائے ۔ "مسلم ہیں ہم' وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا نعرہ لگتا تو یقیناً پھر مہاجر قومیت کا نعرہ بھی نہ لگتا اور مہاجر بھی اسی وسیع مسلم برادری کا حصہ بن کر بنیان مرصوص بن جاتے۔ ملک میں پہلے سے موجود پنجابی' سندھی' بلوچی اور پختون قومیتوں (اور چاروں صوبے بھی ان ہی ناموں سے موسوم ہیں) کے مقابلے میں اپنے مادی حقوق کی حفاظت کے لئے اردو بولنے والے مہاجر قومیت کا نعرہ بلند کرنے پر مجبور ہو گئے یا کر دیئے گئے۔

اس منفی ردعمل کی پشت پر ایک سبب یہ بھی تھا کہ صوبہ پنجاب مکمل طور پر اور سرحدی صوبے کے کچھ اضلاع مختلف اعتبارات سے خوشحال تھے اور سول و ملٹری بیوروکریسی میں بھی ان کا پلڑا خاصا بھاری تھا۔ لہٰذا ان عوامل نے بھی احساس محرومی کو مہمیز دی۔ اس طرح دینی و ملی عصبیت کی عدم موجودگی نے دیگر عصبیتوں کو بالاتر کر دیا اور پھر بنگلہ دیش کا حادثہ معرض وجود میں آگیا۔ اس لسانی عصبیت کی پرورش اور بالاتری کا یہ اندوہناک نتیجہ نکلا کہ اردو بولنے والے بہاری دو نسلوں سے بنگلہ دیش میں کیمپوں میں مقید زندگی گزار رہے ہیں لیکن مسلمان ملک بنگلہ دیش میں بنگالی بولنے والے ہندو اور غیر مسلم بنگلہ دیشی مسلمانوں کے شانہ بشانہ زندگی کے جملہ مراحل طے کر رہے ہیں۔ گویا لسانی عصبیت نے دینی عصبیت کو پچھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ اسلام قومی' علاقائی' لسانی' اور ثقافتی عصبیتوں کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لہٰذا ان بنیادوں پر منسلک واقعی حقوق کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ لہٰذا ان حقوق کا مطالبہ حق ہے اور غداری کی تہمت لگا کر ختم کرنا خود اپنے پورے وجود کو معرض خطر میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

ہمیں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ تحریک پاکستان کے وقت اور پاکستان بن جانے کے بعد بھی زیادہ قربانیاں ان لوگوں نے ہی دیں جن کو بنگلہ دیش میں بہاری اور سندھ میں "مہاجر" کہا جاتا ہے اور جو ہندوستان میں مسلسل ہندوؤں کے زیر عتاب ہیں (ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوئے) لہٰذا ان کو اصولاً پاکستان میں V.I.P.Treat کیا جانا چاہئے تھا لیکن ان کو برابر کا شہری بھی سمجھنے سے اب تک انکار کیا جا رہا ہے۔

یہاں مہاجروں کے جرم کا بھی تذکرہ ہو جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ مہاجرین بھی یہاں آکر اسلام کے نفاذ کی بجائے دنیا کے پجاری بن کر رہ گئے اور جس کے پاس چار پیسے آگئے اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پردے کو خیرباد کہہ دیا۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے جو انہیں مل رہی ہے۔ آپ نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ہجرت مدینہ کی طرح ان مہاجروں کو بھی دہلی اور کلکتہ حاصل کرنا چاہئے یعنی دوسرے لفظوں میں ان کی قربانیوں کے ثمر پاکستان سے ہم فیض یاب ہوتے رہیں اور وہ (جبکہ ہم ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں) اکیلے دوبارہ اسی ہندوستان میں واپس لوٹ جائیں گویا آپ کیا یہ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارا پیچھا چھوڑیں اور پورے ہندوستان کو فتح کریں جبکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم گیارہ کروڑ پر مشتمل ایک بڑے ملک کی حکومت کے وسائل رکھتے ہوئے بھی گزشتہ پچاس سال میں کشمیر آزاد نہیں کرا سکے تو مہاجروں سے یہ مطالبہ کرنا چہ معنی دارد؟ اس طرح کا استہزائی انداز کسی کو بھی زیب نہیں دیتا اور اس سے مزید شر پھیلنے کا ہی امکان ہے۔ مدینہ میں اسلامی حکومت (نظام عدل و قسط) کے نفاذ کے بعد مسلمان مکہ کی طرف بڑھے تھے۔ تنظیم اسلامی کا بھی تو یہی نعرہ ہے کہ پاکستان میں اللہ کا نظام نافذ کرو اور پھر کشمیر' دہلی اور کلکتہ کی طرف اس کا رخ پھیرو۔ آپ کے اپنے خط کا شق وار جواب بھی حاضر ہے۔

① کراچی پاکستان کا دماغ اور سر ہے۔ آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک لیکن یہ سر اور دماغ انتہائی خطرے سے دوچار ہے لہٰذا جس طرح انسان کے سر اور دماغ کی حفاظت کے لئے موٹر سائیکل سوار ہیلمٹ پہنتے ہیں' کراچی کو بھی "مہاجر" صوبہ کا ہیلمٹ پہنانا ضروری ہو گیا ہے تاکہ یہ محفوظ رہ کر بقیہ دھڑ (پاکستان) کی حفاظت کا موجب بنے۔ البتہ صرف سندھ تقسیم نہ ہو بلکہ package deal کے طور پر بقیہ تینوں صوبے بھی تقسیم کر دیئے جائیں تاکہ دیگر چھوٹی قومیتوں کو بھی احساس محرومی اور اعتراض نہ ہو۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت کا مشرقی پنجاب اب تین صوبوں (ہریانہ' ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب) میں تقسیم ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ کوئی علاقہ ایک صوبہ یا دو تین صوبوں میں تقسیم ہو کر ملک سے باہر تو نہیں نکل جاتا بلکہ متعلقہ علاقائی یا قومی مفادات کی حفاظت و پرورش کے ساتھ ساتھ بحیثیت مجموعی ملکی اور پھر ملی مفادات کی حفاظت و استحکام کا باعث بن جاتا ہے۔ مزید برآں انتظامی معاملات بھی بہتر ہو جاتے ہیں۔

② کراچی پاکستان کے خزانے میں (بقول آپ کے) ۷۰ فیصد ٹیکس جمع کراتا ہے تو صوبہ بن جانے کے بعد یہ ٹیکس کہاں چلا جائے گا؟ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ان (علاقائی' لسانی' ثقافتی صوبائی و قومی عصبیت پر مبنی معاملات) کو تسلیم نہ کر کے بندوق کی نوک پر حل نہ کیا جائے (جیسے کہ مشرقی پاکستان میں کیا گیا اور اب کراچی میں کیا جا رہا ہے) بلکہ مروجہ جمہوری طریق پر اسمبلیوں میں مذاکرات کے ذریعے کچھ لو اور کچھ دو کے طریق پر حل ہونا چاہئے۔ جو کچھ دیا جائے گا وہ بھی پاکستان کے اندر رہے گا اور جو کچھ لیا جائے گا وہ بھی پاکستان کے اندر رہے گا۔ البتہ اس لینے اور دینے میں عدل و انصاف پر مبنی برحق صورتوں کو اختیار کیا جانا چاہئے تاکہ پاکستان برقرار اور مضبوط رہے وگرنہ پاکستان کی کشتی میں کمزوری سے اس میں بسنے والی تمام قومیتوں' برادریوں' خاندانوں اور قبائل' خواہ کسی بھی بنیاد پر ہوں کو نقصان پہنچے گا اور خدانخواستہ اس کے ڈوبنے سے سب ڈوبیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ صوبہ بنانا ہی ہے تو ان کو تھرکا علاقہ دیا جائے جسے وہ خود تعمیر کریں۔ گزارش ہے کہ قیام پاکستان کے وقت کے کراچی کو یاد کیجئے کہ وہ کیا تھا!! (ڈیڑھ لاکھ آبادی تھی) موجودہ کراچی ان مہاجروں کی ہی محنتوں' صلاحیتوں' لیاقتوں اور مسلسل تعمیر کا مظہر ہے۔ سندھ کے رہنے والوں میں اب بھی تعلیم و صلاحیت کا معیار آپ کو ان کے مقابلے میں بہت پست اور کم تر ملے گا۔

③ کراچی کے صوبہ بننے کے لئے یہی حالات زیادہ مناسب ہیں اور متقاضی بھی ہیں اور خطرہ ہے کہ یہ بین الاقوامی شہر کے طور پر امریکہ کی ہوس اقتدار کا شکار نہ ہو جائے۔ گویا ان حالات میں اس کے بچاؤ (صوبہ بنا کر) کا اہتمام نہ کیا گیا تو یہ پاکستان سے کاٹا بھی جا سکتا ہے (دشمنوں کی سازشوں کے ذریعے) اور پھر

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

# اقتدار احمد مرحوم ..... ایک سچے صحافی اور انسانیت نواز آدمی

## وہ قول و فعل کے تضاد سے پاک تھے

تنویر قیصر شاہد

### ان کا پرچہ "ندا" چند "کاروباری" صحافیوں کو ایک آنکھ نہ بھایا

"ندائے خلافت" کے بانی مدیر' اقتدار احمد مرحوم کو ان کی وفات کے بعد جو خراج تحسین ملک کے معروف اہل علم و دانش اور اہل قلم حضرات کی جانب سے پیش کیا گیا اس پر مبنی "ندائے خلافت" کی ایک خصوصی اشاعت ماہ جولائی میں منصہ شہود پر آگئی تھی۔ اس کے بعد بھی مرحوم کی شخصیت کے حوالے سے بعض اہل قلم حضرات کے مضامین اخبارات و جرائد میں ہماری نظر سے گزرتے رہے ہیں۔ ان سب کا احاطہ تو اب پیش نظر نہیں ہے۔ تاہم حال ہی میں روزنامہ پاکستان میں شائع ہونے والے تنویر قیصر شاہد کے مضمون کو اس اعتبار سے ہدیہ قارئین کرنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ یہ نوجوان صحافی ان معدودے چند صحافیوں میں شامل ہیں جن کے ساتھ مرحوم مزاجی ہم آہنگی محسوس کرتے تھے اور بعض راز کی باتیں بھی کہہ دیتے تھے۔

ایک لمبے سفر اور ذہنی پریشانی کے عبوری دور سے گزر کر واپس لاہور پہنچا تو برادرم رؤف امجد خان نے مجھے فون پر یہ اندوہناک خبر سنائی کہ اقتدار احمد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے اس کی قطعی توقع نہیں تھی کہ اقتدار احمد ہم سے اتنی جلدی رخصت ہو جائیں گے اور وہ بھی اس قدر اچانک! وہ تھوڑا عرصہ قبل ریڑھ کی ہڈی کے ایک مہرے کی تکلیف میں مبتلا تھے جو بعد ازاں شدید آزار کی شکل اختیار کر گیا تھا' مگر پھر اس میں افاقہ بھی ہو گیا تھا۔ فون پر ان سے ان کے حال احوال کے بارے میں انہی کی زبانی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ بعد ازاں انہوں نے بائیوپسی کروائی تو میں نے ان سے بذریعہ فون ان کی خیریت دریافت کی اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ جس بات کا ڈر تھا' بائیوپسی کے ذریعے اس کی نفی ہو گئی ہے ... مگر پھر اچانک وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ رؤف امجد خان مجھے ان کی موت کی خبر سناتے ہوئے حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ اتنے روز گزر گئے اور تمہیں واقعی اس کی خبر نہیں؟ اور میں فون کا چونگا تھامے سوچ رہا تھا اور دل کو بقول فراق گورکھپوری کئی کہانیاں سی یاد آ رہی تھیں۔

اقتدار احمد نہ صرف میرے دوست تھے بلکہ ایک شفیق بزرگ اور مہربان بھی تھے۔ اب ہاتھ میں قلم لئے سوچ رہا ہوں اور ان سے ہم کلامیوں کے ایام شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ اقتدار احمد کا چہرہ بار بار ابھر رہا ہے' ڈوب رہا ہے۔ ایک عالم دین کا چہرہ' ایک اخبار نویس کا چہرہ' ایک محنتی صنعت کار کا چہرہ' ایک دیانت پرست تاجر کا چہرہ اور ایک کتاب دوست اور انسانیت نواز انسان کا چہرہ! ان سے وابستہ کئی یادیں' کئی رنگوں میں مجسم حالت میں میرے سامنے رقص کناں ہیں اور ان سے ہم کلامی کے ان گنت لمحات دلکش آہنگوں میں میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"ندا" منصۂ شہود پر آیا تو جنرل ضیاء الحق کا تنازعہ' ہنگامہ پرور اور ہنگامہ خیز دور اپنے آخری برس گزار رہا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ "ندا" کے پہلے شمارے کے صفحہ اول پر کالا باغ ڈیم کی رنگین تصویر تھی جو کسی فنکار کے تصور کا عکس تھا۔ اندرونی صفحات پر کالا باغ ڈیم کے پس منظر میں ضیاء الحق کے دور کی بھی گوشمالی کی گئی تھی اور شکوہ کیا گیا تھا کہ جنرل ضیاء الحق اگر چاہتے تو یہ پراجیکٹ بہ احسن طریقے سے پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ "ندا" اپنی شکل میں منفرد اور رزم آرا پرچہ تھا جسے اقتدار احمد نے واقعی اپنے خون جگر سے سینچنے کی کوشش کی تھی اور پھر جلد ہی ملک کے سنجیدہ طبقے کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا لی۔ اقتدار احمد مذہب پسند شخص تھے۔ اس حوالے سے فطری طور پر ان کا جھکاؤ دائیں بازو کے گروپ کی طرف تھا مگر ان کی وسیع القلبی دیکھئے کہ ان کے رسالے میں عبداللہ ملک' جن کا شمار پاکستان کے مذہب بیزار اور دائیں بازو کے گروپ کے بزرگ دانشوروں میں کیا جاتا ہے' باقاعدہ لکھ رہے تھے اور ان کی تحریروں کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ عبداللہ ملک کے حوالے سے ہی ان کا ایک بار ملک کے معروف کالم نگار جناب مجیب الرحمٰن شامی سے فون پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ راقم ان دنوں ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" جو مجیب الرحمٰن شامی صاحب کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا' میں نائب مدیر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ شامی صاحب نے اپنے دفتر سے اقتدار صاحب کو فون کیا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اقتدار احمد کو طنز کیا کہ ماشاء اللہ آپ ہیں تو ڈاکٹر اسرار احمد کے برادر خورد مگر آپ کے جریدے میں عبداللہ ملک ایسے لوگ دھڑلے سے شائع ہو رہے ہیں۔ آگے سے انہیں جو جواب ملا' اس کے رسپانس میں شامی صاحب کا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا اور فون چند ثانئے بعد بند ہو گیا۔ میں اس وقت ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ خاصے عرصہ بعد جب میں نیویارک میں تھا۔ ایک روز میں نے ہفت روزہ "زندگی" جو شامی صاحب کی زیر ادارت لاہور سے شائع ہونے لگا تھا' نیویارک کے علاقہ جیکسن ہائٹس سے خریدا' جس میں نمایاں حروف میں اعلان کیا گیا تھا کہ اب انشاء اللہ ہر ہفتے ملک کے ممتاز دانشور جناب عبداللہ ملک ہفت

> "اقتدار احمد سچے' سیدھے اور کھرے انسان تھے۔ ان کی شخصیت ان کی گفتگو کی طرح ہر قسم کے الجھاؤ اور ہیر پھیر سے پاک ہوتی تھی۔ کھری بات کرتے خواہ سننے والے کو بری ہی کیوں نہ لگے"

روزہ "زندگی" میں لکھا کریں گے۔ میں نے یہ اعلان پڑھا تو مجھے معاً اس روز کی تلخی یاد آ گئی جو عبداللہ ملک کے حوالے سے اقتدار احمد اور مجیب الرحمٰن شامی کی گفتگو میں در آئی تھی۔ مجھے یہ احساس شدت سے پریشان کرنے لگا کہ انسان بھی عجیب طرفہ تماشا ہے۔ ایک وقت میں ایک شے یا ایک انسان یا ایک ادارہ اس کے نزدیک شجر ممنوعہ اور گردن زدنی قرار پاتا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں وہی شے' وہی ادارہ یا وہی انسان اس کے لئے نعمت عظمیٰ سے کم نہیں ہوتا! شاید انسان تضادات ہی کا مجموعہ ہے؟

مگر اقتدار احمد' خدا ان کی قبر کو نور سے بھر دے' کی شخصیت میں تضاد نہیں تھا۔ میری ان سے جتنی بھی ملاقاتیں اور گفتگو میں رہیں' میں نے ہمیشہ یہ پایا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں' اس پر عمل بھی کرتے ہیں' وہ سود کے خلاف تھے' اس لئے انہوں نے کبھی کسی مالیاتی ادارے سے سود پر قرض نہ لیا۔ وہ مکروہ رسوم و رواج والی شادیوں کے شدید خلاف تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی شادیاں انتہائی سادہ طریقے اور مسنون انداز میں انجام دیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی رہنمائی میں

**ایک معروف صحافی نے اقتدار احمد کو طنز کیا کہ ماشاء اللہ آپ ہیں تو ڈاکٹر اسرار احمد کے برادر خورد مگر آپ کے جریدے میں عبداللہ ملک ایسے لوگ دھڑلے سے شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنے پرچے میں اعلان شائع کیا کہ "اب ان شاء اللہ ملک کے ممتاز دانشور جناب عبداللہ ملک بھی ہمارے پرچے میں لکھا کریں گے"!!**

انہوں نے اپنے بیٹوں کے نکاح مسجد میں کروائے اور کسی بھی قسم کی عوامی رسم اور رواج سے قطعی گریز کیا۔ نکاح کے وقت ہر قسم کے شور شرابے سے خود کو دور رکھا۔ وہ اپنے دوستوں کے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں کی دعوتوں میں بھی شرکت کرنے سے انکار کر دیتے تھے' جن کے بارے میں انہیں خدشہ ہوتا کہ وہاں رسوم و رواج کی بھرمار ہو گی۔ مجھے "سیارہ ڈائجسٹ" کے ایڈیٹر جناب امجد رؤف خان نے ایک واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی پر اقتدار احمد صاحب کو بلایا تو انہوں نے اس بنا پر صاف انکار کر دیا کہ میں رسوم و رواج والی شادیاں نہ تو منعقد کرتا ہوں اور نہ ہی ایسی شادیوں میں شرکت کرتا ہوں۔ امجد خان کا کہنا ہے کہ مجھے امید نہ تھی کہ وہ انکار کریں گے مگر اس سچ پرست اور قول و فعل میں ہم آہنگ آدمی نے ایسا کر دکھایا۔

اقتدار احمد' ڈاکٹر اسرار احمد کے برادر خورد تو تھے ہی لیکن برادرانہ ناطے کے علاوہ دونوں میں ایک اور رشتہ بھی تھا جو غالباً اول الذکر سے زیادہ مضبوط' مربوط اور پائیدار تھا اور یہ رشتہ تھا مرشد اور مرید کا' رہنما اور پیروکار کا! ڈاکٹر اسرار احمد "تنظیم اسلامی" کے سربراہ ہونے کے ساتھ اپنی تنظیم کے تمام وابستگان کے مرشد اور مرید بھی ہیں۔ وہ "تنظیم اسلامی" میں شریک ہونے والے ہر فرد سے بیعت لیتے ہیں اور اسے پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے اور بعد ازاں مملکت خداداد میں نظام خلافت کے نفاذ کے لئے انتہائی ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ اقتدار احمد "تنظیم اسلامی" کے رکن رکین تھے بلکہ ان کا شمار تنظیم کے بانی ارکان میں ہوتا تھا۔ وہ بڑے فخر اور انبساط کے ساتھ میرے سامنے اپنا ڈاکٹر اسرار احمد کا مرید و پیروکار ہونے کا اظہار کرتے۔ ہر مرید کی طرح وہ بھی ڈاکٹر اسرار احمد کی مخالفت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کو وہ بھائی جان نہیں بلکہ ہمیشہ "ڈاکٹر صاحب" کہتے تھے' کم از کم میرے سامنے وہ ان کا ذکر انہی الفاظ میں کرتے تھے' وہ ڈاکٹر صاحب سے جنون کی حد تک محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے "ندا" کو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنظیم کا بین السطور ترجمان بھی بنا دیا تھا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے کسی اداراتی رکن کی خصوصی طور پر ڈیوٹی لگائی جاتی کہ وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے جمعہ کے خطبہ کے اہم نکات کو نوٹ کرے جنہیں دوسرے روز اخبارات میں پریس ریلیز کے نام سے شائع کرایا جاتا اور اسی ہفتے وہی ارشادات "ندا" کی زینت بنائے جاتے۔ اقتدار احمد بطور خاص خطبہ جمعہ کو پڑھتے اور اپنی نگرانی میں اسے "ندا" کے صفحات میں پیسٹ کراتے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اقتدار احمد صاحب ڈاکٹر اسرار احمد کی مخالفت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ان کے ہفت روزہ جریدے میں کام کرنے والوں میں ایک سابقہ ساتھی مقبول الرحیم مفتی نے لاہور سے شائع ہونے والے ایک تیسرے درجے کے ہفت روزہ جریدے (غالباً "مہارت" اس پرچے کا نام تھا) میں ایک مضمون لکھا جو ڈاکٹر اسرار احمد کی کردار کشی کے مترادف خیال کیا گیا۔ میں اس روز اقتدار احمد صاحب کے ساتھ ان کے تعمیراتی دفتر (زد سیکرٹریٹ لاہور) میں بیٹھا تھا کہ کسی نے اس مضمون کا ذکر چھیڑ دیا۔ اقتدار صاحب نے اسی وقت دفتر کے معاون کو بازار بھیج کر وہ پرچہ منگوایا اور مذکورہ مضمون پڑھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر دکھ اور انقباض کی لکیریں کھنچ گئی ہیں۔ انہوں نے مضمون نگار کے بارے میں دعائیہ کلمات کہے اور آخر میں اتنا کہا "ارے بھائی! آپ کی یہ صحافت بھی عجیب شے ہے"۔

اقتدار احمد سچے' سیدھے اور کھرے انسان تھے۔ ان کی شخصیت ان کی گفتگو کی طرح ہر قسم کے الجھاؤ اور ہیر پھیر سے پاک ہوتی تھی۔ کھری بات کرتے خواہ سننے والے کو بری ہی کیوں نہ لگے۔ "ندا" میں ہر جگہ ان کے کردار کا یہ وصف نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے' مگر صحافت میں بعض اوقات ملفوف انداز میں اشارتاً بات کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن وہ اس "آرٹ" کو دانستہ اختیار کرنے سے ہمیشہ پہلوتہی کرتے رہے۔ انہوں نے بڑی محبت' ذوق و شوق اور آن بان سے ہفت روزہ "ندا" کا اجراء کیا۔ اس پر لاکھوں روپیہ خرچ کر ڈالا۔ اپنے ایڈیٹرز اور معاونین کو جدید سہولتیں اور بہترین معاوضے دیئے مگر شومئی قسمت سے اس میدان میں انہیں بعض پیشہ ور اخبار نویسوں کے ہاتھوں چند ایک ایسے چرکے لگے کہ وہ بددل ہو گئے جو رفتہ رفتہ "ندا" کی بساط ہی لپیٹ دیئے جانے پر منتج ہوئے اور آخر کار "ندا" کو "ندائے خلافت" کی عبا پہنا کر انہوں نے اسے کلی طور پر "تنظیم اسلامی" کے لئے وقف کر دیا۔ "ندائے خلافت" کے بھی تمام اخراجات ان کے سپرد تھے اور اس معاملے میں انہوں نے کبھی چیں بہ جبیں نہ کیا۔

مجھے "ندا" میں اقتدار احمد کے ساتھ چند روز کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے اس کے کریڈٹ پیج پر میرا نام ڈپٹی ایڈیٹر کی حیثیت سے درج بھی کروایا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب تمام معاملات طے پا گئے تو انہوں نے میرا اپائنٹمنٹ لیٹر تیار کر کے میرے ہاتھ میں تھما دیا جس پر میری تنخواہ اور فرائض کے تمام امور کا اندراج تھا۔ یہ نوکری نامہ آج بھی میرے پاس

محفوظ ہے اور اقتدار صاحب کی شفقتوں کی یاد دلاتا ہے۔ مگر "ندا" جوائن کرنے کی وجہ سے ایک سانحہ بھی رونما ہوا۔ ہوا یوں کہ اسی وقت میں لاہور ہی سے شائع ہونے والے ایک ماہنامے میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کر رہا تھا۔ میرا "ندا" جوائن کرنا میرے ایڈیٹر کو برا لگا' انہوں نے مجھے تو کچھ نہ کہا مگر اقتدار صاحب کو فون کر کے ان سے ایسا کلام کیا جو اقتدار احمد کی دل شکنی کا باعث ہوا۔ وہ صلح جو اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ دوسرے روز میں دفتر آیا تو اقتدار احمد نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ ارے بھائی (یہ ان کا تکیہ کلام تھا) آپ کے سابقہ ایڈیٹر کہہ رہے تھے کہ میں زیادہ تنخواہ دے کر ان کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو اپنے ہاں ملازمت دے کر ان کے ادارے کو نقصان پہنچا رہا ہوں' اگر آپ کو برا نہ لگے تو آپ وہاں دوبارہ چلے جائیں۔ میں نے دوبارہ سابقہ ماہنامے میں ملازمت شروع کر دی' مگر کچھ عرصہ بعد اسی حوالے سے ایک اور واقعہ پیش آیا۔ میرے ایڈیٹر نے لاہور سے ایک ہفت روزے کا اجراء کیا تو میں نے اس میں ڈپٹی ایڈیٹر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت "ندا" بھی زوروں پر تھا۔ میرے ایڈیٹر کی طرف سے میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ "ندا" میں کام کرنے والے فلاں نوجوان اخبار نویس کو توڑ کر اپنے ہفت روزہ میں لاؤ۔ یہ کوشش (جو قطعی غیر مستحسن تھی) بروئے کار آئی اور وہ نوجوان اخبار نویس "ندا" چھوڑ کر ہمارے جریدے کا ادارتی رکن بن گیا۔ چند روز بعد اقتدار احمد سے میں ان کے ہیڈ آفس میں ملا تو انہوں نے مجھے پرانا واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا کہ اس وقت جب آپ نے "ندا" جوائن کیا تھا تو آپ کے ایڈیٹر کا یہ ردعمل تھا اور آج وہی الفاظ اگر میں (ان کے نوجوان اخبار نویس ساتھی کے "ندا" چھوڑنے پر) آپ کے ایڈیٹر کے سامنے دہراؤں تو کیسا لگے گا؟ میں خاموش ہو گیا' کیا کہہ سکتا تھا؟ مگر اتنا واضح طور پر یاد ہے کہ ان کے الفاظ میں بلا کی شدت تھی جس میں رنج پر تاسف غالب آ گیا تھا۔

وہ ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ قرض حسنہ بھی دے دیتے تھے مگر اس کے لئے قرض لینے والا قرض کی واپسی کے لئے جو وعدہ کرتا' اقتدار احمد امید کرتے کہ لوگ اپنے وعدے کا پاس کریں گے' اس میدان میں بھی انہیں خاصے ناخوشگوار تجربات میں سے گزرنا پڑا۔ میری ذاتی انفارمیشن کے مطابق (جس کی اقتدار احمد نے اپنی زندگی میں تصدیق کر دی تھی) لاہور کے دو اخبار نویسوں کی' جب انہیں روپوں کی شدید ضرورت تھی' بروقت مالی امداد کی اور بعد ازاں دونوں کو قرض حسنہ بھی دیا۔ ایک صحافی جو خاصے شہرت یافتہ ہیں اور اپنی نثر میں خاص اسلوب کے حامل ہیں' مصنف اور کالم نگار بھی ہیں' کو انہوں نے ستر ہزار روپے دیئے۔ اقتدار احمد نے میرے مسلسل استفسار کے بعد مجھے بتایا کہ "ستر ہزار روپے قرضہ حسنہ لینے والے صاحب نے مجھے کہا تھا کہ اسلام آباد میں میرا ایک پلاٹ ہے' میں اس کو فروخت کر رہا ہوں' جونہی وہ بکتا ہے' میں آپ کو رقم لوٹا دوں گا"۔ جب میری اس موضوع پر ان سے گفتگو ہو رہی تھی' اس وقت اس قصے کو ڈیڑھ سال گزر گیا تھا اور اس وقت تک مقروض نے رقم اقتدار صاحب کو واپس نہیں کی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ رقم واپس ہی نہ کریں تو؟ ہنس کر کہنے لگے' "میں بھی تقاضا نہیں کروں گا' قیامت کے روز چپکے سے میں اپنی برائیاں' خدا کے وعدے کے مطابق' ان کو دے دوں گا اور ان کی اچھائیاں اور نیکیاں اپنے پلڑے میں ڈال لوں گا"۔ یہ کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ سگریٹ نوش کرنے لگے۔ ایک دوسرے اخبار نویس نے ان سے ۲۵ ہزار روپے اس وعدے پر لئے تھے کہ میری شادی ہو رہی ہے' شادی میں جو سلامیاں وغیرہ ہوں گی' وہ رقم اکٹھی کر کے اور اس میں کچھ ملا کر آپ کو واپس کر دوں گا۔ اس کے لئے موصوف نے جو وعدہ کیا تھا' اس پر وہ پورا نہ اتر سکے تو اقتدار احمد کو اس کا شدید دکھ ہوا۔ دکھ اس بات کا نہیں کہ انہیں ۲۵ ہزار روپے کی فکر تھی' نہیں' بلکہ اس وعدہ خلافی کی جو مسلسل اس اخبار نویس کی طرف سے ہو رہی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ صحافی کی شادی بھی نہ ہو پائی تھی' اگرچہ بہت بعد میں یہ رقم اقتدار احمد کو ٹیڑھی انگلیوں سے مل گئی تھی مگر پھر وہ خاصے محتاط ہو گئے تھے۔

اقتدار احمد انسان تھے' فرشتہ نہیں تھے۔ ان سے بھی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی کہ آخر انسان خطاؤں کا پتلا ہے' مگر میں جتنا کچھ انہیں جانتا ہوں' جتنا عرصہ میرا ان سے ربط و ضبط رہا' میں نے دیکھا کہ وہ خوبیوں اور اچھائیوں کا پیکر تھے۔ وہ رازوں کے امین اور وفا کیش انسان تھے۔ "ندا" میں' میں نے میجر ایس جی جیلانی کی انگریزی کتاب

Fifteen Governers I served with

کا ترجمہ "پندرہ گورنر پندرہ کہانیاں" کے نام سے شروع کیا۔ ترجمہ نگار کا نام نعیم احمد شائع ہوتا تھا۔ میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ اقتدار صاحب' نام کا راز آپ کے اور میرے درمیان ہے' اسے افشا نہیں ہونا چاہئے' چنانچہ انہوں نے اس وعدے کو نبھایا۔ جب تک یہ اقساط شائع ہوتی رہیں' ان کے دفتر کے کسی فرد کو معلوم نہیں تھا کہ نعیم نام کا کون مترجم ہے۔ چند برس بعد ان اقساط کو یکجا کر کے ایک اشاعتی ادارے نے کتاب کی شکل میں شائع کرنا چاہا تو مجھ سے رابطہ کیا گیا۔ میں نے ہاں کرنے سے قبل اقتدار صاحب سے رابطہ کیا اور ان کی اجازت چاہی۔ انہوں نے خوشی سے اجازت دے دی۔ کتاب آخری مراحل میں داخل ہوئی تو میں نے اس کا انتساب ان کے نام کرنا چاہا مگر اقتدار احمد نے انکساری سے کام لیتے ہوئے سختی سے انکار کر دیا۔

عرصہ دراز سے انہیں متعدد بیماریوں نے گھیر رکھا تھا' مگر انہوں نے کبھی ان کی پروا نہیں کی۔ کام کرتے رہے اور بیماری کے احساس پر ہمہ وقت غالب آنے کی سعی کرتے رہے۔ ان کا خون نارمل حالت سے زیادہ گاڑھا ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے ان کے بدن کی اینٹھن اور سر کے درد میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا تھا' چنانچہ جب درد حد سے تجاوز کر جاتا تو وہ جسم سے خون نکلوا دیتے تھے۔ مجھے متعدد بار ہنس کر فرمایا "ارے بھائی' میرا خون تو اتنا گاڑھا ہے کہ پانی مکس کر کے بھی کام چلایا جا سکتا ہے"۔ وہ بلا کے سگریٹ نوش تھے بلکہ اس ضمن میں انہیں "چین سموکر" کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس وجہ سے وہ کھانسی کے حملوں کی زد میں رہتے تھے' بعض اوقات یہ حملے اتنے شدید ہوتے کہ سینہ تھام کر رہ جاتے۔ اس وجہ سے بھی وہ مجالس میں شریک ہونے سے اغماض برتتے۔ میں نے انہیں

"وہ ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ قرض حسنہ بھی دے دیتے تھے مگر اس کے لئے قرض لینے والا قرض کی واپسی کے لئے جو وعدہ کرتا' اقتدار احمد امید کرتے کہ لوگ اپنے وعدے کا پاس کریں گے' اس میدان میں بھی انہیں خاصے ناخوشگوار تجربات میں سے گزرنا پڑا"

لاہور کے ممتاز اخبار نویسوں کی انجمن (پریس کونسل آف انٹرنیشنل افیئرز) کا رکن بنانا چاہا' جو خاصا دشوار بھی تھا۔ ایک ہفتہ وار مجلس میں وہ شریک بھی ہوئے۔ میٹنگ کے اختتام پر انہوں نے مجھ سے معذرت چاہی اور پھر سانس کی دھونکنی کو تھامتے ہوئے کہا "ارے بھائی' میری یہ کھانسی مجھے چین نہیں لینے دیتی اور میں نہیں چاہتا کہ اہل مجلس کو پریشان کرتا رہوں"۔ اس کے بعد وہ کبھی ہماری انجمن میں تشریف نہ لائے۔ "ندا" کے عروج کے زمانے میں انہوں نے' سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر امجد رؤف خان اور ممتاز کالم نویس رفیق ڈوگر وغیرہ سے مل کر ایک علیحدہ انجمن کا ڈول بھی ڈالا تھا۔ اس کی چند ایک میٹنگز ایک مقامی ہوٹل میں منعقد بھی ہوئی تھیں' مگر پھر یہ مجلس پریشان ہو گئی۔ وہ جب بھی اس انجمن میں شریک ہوتے' دوسرے روز مجھے فون پر گپ شپ کا احوال سناتے اور آخر میں اپنی کھانسی کا شکوہ ضرور کرتے۔ بعد ازاں انہوں نے سگریٹ چھوڑنے والی Tablets (جن میں سگریٹ کا نکوٹین بھی ہوتا ہے) استعمال کرنا شروع کر دی تھیں۔ یہ tablets وہ امریکہ سے منگواتے تھے' خاصی مہنگی ہوتی تھیں' مگر ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے سامنے متعدد بار وہ نکیہ منہ میں ڈالتے اور اس کے ساتھ ہنستے ہوئے کہتے' "ارے بھائی! جو مزہ سگریٹ میں ہے' اس کم بخت میں کہاں؟" گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے مجھے خاصی مرتبہ بتایا کہ سگریٹ سلگا کر وہ تین گنا زیادہ کام کر جاتے ہیں۔

قارئین "ندا" کو انہوں نے خاکہ نگاری کے ایک نئے اسلوب سے روشناس کرایا۔ ہارون الرشید اور معروف صوفی دانشور جعفر قاسمی (مرحوم) کے لکھے گئے خاکوں کو انہوں نے بڑی جرات کے ساتھ "ندا" کے صفحات میں نمایاں جگہ دی۔ جعفر قاسمی کے خاکوں نے "ندا" کی شہرت کو دوچند کر دیا۔ کوثر نیازی پر لکھا گیا ان کا خاکہ ایک بڑے بحران کا باعث بنا' مگر انہوں نے اپنے لکھاری کا دفاع کیا۔ ان خاکوں کو بڑی پذیرائی ملی۔ ظاہر ہے "ندا" کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا۔ مجھے متعدد بار اقتدار احمد کے آرام دہ دفتر میں جعفر قاسمی مرحوم سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک علمی اور ادبی مگر کسی حد تک متکبر انسان تھے' اس کے باوجود اقتدار احمد صاحب ان کو پورا پورا احترام اور محبت دیتے۔ یہ ایک دل موہ لینے والا منظر ہوتا تھا۔

اقتدار احمد اپنے جریدے کے دفتر میں بھی "چیئرمین صاحب" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ دراصل وہ ایک معروف تعمیراتی فرم کے خالق اور مالک بھی تھے' جسے انہوں نے بڑی محنت اور دیانت کے جذبے سے سرشار ہو کر وطن عزیز کی نامور فرموں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس فرم کا ہر ملازم انہیں چونکہ چیئرمین صاحب کہہ کر پکارتا تھا' اس لئے "ندا" کے دفتر میں بھی اکثر لوگ انہیں اسی نام سے یاد کرتے تھے' خصوصاً ان کے اکاؤنٹنٹ بٹ صاحب! میرا دفتر چونکہ ان کے دفتر سے تقریباً متصل تھا' اس لئے میں اکثر اوقات نماز ظہر کے وقت وہاں چلا جاتا۔ وہ اور ان کے بیٹے اور دوسرے قریبی عزیز' جو فرم کے

> "انکی تحریروں میں شعری چاشنی کا عنصر بڑا نمایاں تھا۔ یہ عنصر انکی تحریر کو دلکشی عطا کرتا تھا' بعض مصرعوں کو انتہائی مناسب انداز میں بروئے کار لاتے"

نمایاں افراد میں شامل ہیں' نماز ظہر دفتر کی سب سے اوپر والی منزل پر باجماعت ادا کرتے۔ ایک مرتبہ میں ظہر کے نوافل بیٹھ کر ادا کر رہا تھا' مجھے دیکھا اور پھر فرمایا "آپ تو روایتی مسلمان ہیں" پھر کہنے لگے کہ اگر آدمی میں ہمت اور توانائی ہو تو اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ کھڑے ہو کر نوافل ادا کرے۔ اب اگر مجھے کبھی نماز ادا کرنے کی سعادت میسر آئے تو نوافل ادا کرتے وقت اقتدار احمد کا مسکراتا ہوا چہرہ سرگوشی کرتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مذکورہ دفتر میں ہی نماز ظہر کے بعد وہ سب اکٹھے کھانا کھاتے۔ اکثر اوقات کھانا ایک ہی بڑی میز پر چن دیا جاتا۔ اقتدار احمد کھانے کے دوران بڑے شگفتہ انداز میں سیاست و صحافت کی دنیا پر تبصرہ کرتے' پھر گفتگو کرتے کرتے اچانک میری طرف رخ موڑ کر کہتے "ارے بھائی' آپ تو صحافی اور سیاسی حلقوں میں چلتے پھرتے ہیں' آپ ہی بتایئے کہ اب آسمان سیاست کیا رنگ اختیار کرنے والا ہے"۔

جماعت اسلامی کے وہ بھی محترمی و مکرمی ڈاکٹر اسرار احمد کی طرح شدید مخالفوں اور نقادوں میں سے تھے' مگر اس کے باوجود ان کی کسی بھی تحریر کو جو جماعت اسلامی کے ریفرنس میں لکھی گئی' اسلامی اخلاقیات سے گرا ہوا اور سوقیانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ محتاط اور حقیقت پر مبنی مضامین لکھنے والے تھے۔ ان کے پاس جماعت اسلامی کے خلاف لکھے ہوئے مضامین بھی آتے تو وہ ایڈیٹنگ کرتے وقت خاص طور پر خیال رکھتے کہ کوئی فقرہ' جملہ یا لفظ کردار کشی اور دل شکنی کا باعث نہ ہو۔ اس حوالے سے وہ اس راہ کے راہی تھے جس پر کبھی برصغیر پاک و ہند کے نامور انشاء پرداز مولانا ابوالکلام آزاد گامزن تھے۔ حقیقت میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد' خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ دے' کے عاشق تھے۔ وہ بالاستیعاب ہر ہفتے "ندا" میں مولانا ابوالکلام آزاد کے معروف عالم پرچے "الہلال" میں سے کوئی ٹکڑا منتخب کر کے شامل اشاعت کرتے تھے' آزاد کی تحریروں کا انتخاب وہ "الہلال" کی جلدوں سے کرتے۔ "الہلال" کی دو جلدیں' جن کا رنگ ہلکا نیلا تھا' ان کی کتابوں کے ریک میں رکھی ہمہ وقت بہار دیتی رہتیں۔ ان کا خیال اور یقین تھا کہ آج بھی ہمیں ابوالکلام آزاد علیہ رحمت ایسے معتدل' متوازن اور دور اندیش سیاستدان اور سٹیٹس مین کی ضرورت ہے جو تعصبات میں جلتے پاکستان کو امن اور راحت کی ٹھنڈک سے ہمکنار کر سکیں۔

وہ اپنے گھر اور دفتر سے نکل کر لوگوں سے ملنے کم ہی جاتے تھے۔ وہ فون پر دوست اور احباب سے اس ضمن میں معذرت بھی کر لیتے کہ ان کی کھانسی' سانس کا جلد پھول جانا اور دوسرے امراض انہیں دوستوں کی محفلوں اور مجلسوں میں شریک ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہیں' مگر ایک روز انہوں نے میرے دفتر اپنے گاڑی بھجوائی اور مجھے اپنے دفتر بلایا۔ ہم دونوں ان کے دفتر سے نکل کر باہر کھڑی سرخ پجارو میں آ کر بیٹھ گئے (وہ اکثر اپنی سرخ پجارو میں شہر میں آتے جاتے تھے اور گاڑی خود ڈرائیو کرتے تھے) دفتر سے نکل کر ہم معروف صحافی ارشاد حقانی صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ میں خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتا رہا اور مجھے ساتھ ساتھ حیرت ہوتی رہی کہ دونوں کی باتوں سے مترشح تھا کہ دونوں پرانے آشنا ہیں۔ واپسی پر گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اقتدار صاحب سے پوچھا کہ حقانی صاحب کو آپ ذاتی حیثیت میں کب سے جانتے ہیں؟ ہلکے سے قہقہے کے ساتھ اور پھر معمول کے مطابق اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمانے لگے "ارے بھائی' ہم پرانے آشنا ہیں"۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہ اور حقانی صاحب بہت سال پہلے جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ "تسنیم" میں کام کر چکے ہیں۔ روزنامہ "تسنیم" کے مدیر اعلیٰ نصراللہ خان عزیز مرحوم سے وابستہ انہوں نے بہت سی یادوں کو بھی تازہ کیا۔

جنرل ضیاء الحق مرحوم کو وہ شدید ناپسند کرتے

تھے۔ اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار وہ اپنے رسالے میں بھی کرتے رہتے تھے۔ ۱۷/ اگست ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء اس جہان فانی سے جہان باقی کی طرف کوچ کر گئے تو دوسرے ہفتے شائع ہونے والے ان کے جریدے "ندا" میں انہوں نے جنرل ضیاء کی جو تصویر شائع کی (یہ تصویر بہاولپور کے ہوائی اڈے پر کھڑے جہاز میں ان کی آخری تصویر لی گئی تھی) اس کے نیچے مندرج اقتدار احمد صاحب کے قلم سے لکھا گیا کیپشن جنرل ضیاء کے بارے میں ان کے اندرونی جذبات و افکار کا عکاس تھا۔ جنرل ضیاء نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے اسلام کے نام کو جس برے اور بھونڈے طریقے سے استعمال کیا' اس Expliotatin پر اقتدار صاحب شدید ناراضگی اور گہرے رنج کا اظہار کرتے تھے۔ جنرل ضیاء کی وفات کے وقت "ندا" کے انچارج ایڈیٹر معروف صحافی اور ترقی پسند ادیب مسعود اشعر تھے۔ (مسعود اشعر صاحب ایک طویل عرصے تک ملتان میں روزنامہ "امروز" کے بیورو چیف رہے ہیں) اشعر صاحب نے اقتدار صاحب کی فرمائش پر جنرل ضیاء کے بارے میں ایک دلکش اور انکشاف خیز مضمون لکھا جو انکی یادوں پر مشتمل تھا جب جنرل ضیاء ملتان میں کور کمانڈر تھے۔ اس آرٹیل کے بعض مندرجات سے اقتدار صاحب بہت مطمئن دکھائی دیتے تھے کہ اس میں جنرل ضیاء کی اقتدار ہوس پوری طرح آشکار ہوتی تھی۔ جنرل ضیاء کے سیاسی نظریات کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ایک بار فیصل ٹاؤن (لاہور) میں واقع اپنے خوبصورت اور پر شکوہ گھر میں اپنے ہم خیال چیدہ اخبار نویسوں کو اکٹھا کر کے ایک بھرپور مجلس کا اہتمام بھی کیا تھا۔ وہ جنرل ضیاء کے اسلام اور اسلامائزیشن کی کوششوں کو ڈھونگ اور فراڈ سے معنون کرتے تھے۔ اس مجلس کے اختتام پر جب سب لوگ جانے لگے تو انہوں نے مجھے روک لیا اور پھر ہم نے ان کے وسیع ڈرائنگ روم کی فرشی نشست سے بھرپور لطف اٹھایا۔ ان کی نفیس طبیعت کا یہ عالم تھا کہ نجی مجلس میں بھی ان کی زبان سے کوئی لغو اور سوقیانہ جملہ ادا نہ ہوتا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ راقم نے اسی روز ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر شمالی افریقہ کے لاثانی مجاہد عمر مختار پر مبنی فلم Desert Lion بھی دیکھی۔

ان کی تحریروں میں شعری چاشنی کا عنصر بڑا نمایاں تھا۔ یہ عنصر ان کی تحریر کو دلکشی عطا کرتا تھا' بعض مصرعوں کو انتہائی مناسب انداز میں بروئے کار لاتے۔ ان کے اداریوں میں بھی اسی قلمی خاصیت کا اظہار ہوتا۔ اقبال' فیض اور حفیظ کا کلام ان کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے۔OO

(بشکریہ روزنامہ "پاکستان" لاہور ۱۷ اگست ۹۵ء)

## بقیہ : حدیث امروز

ضروری ہے۔ یہ ہے وہ ممکنہ سیلاب جس کی روک تھام کے لئے ابھی سے بند باندھنا لازم ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہوشمندی کے ساتھ' مرد و زن کی باہمی بھلائی کی خواہش کے ساتھ' اللہ رب العزت کے اس حکم کی تعمیل کے انداز میں کہ بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو' احترام و شفقت کے لہجے میں گفت و شنید کے ذریعے کرنا ہوگا۔ سختی و درشتی سے بات بگڑ جائے گی' تحکمانہ انداز سے ردعمل پیدا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی خواتین کی واضح ترین اکثریت دین پسند ہے' خدا یاد ہے' خدا خوف ہے۔ ان کا شکوہ ہمدردانہ موڈ کے ساتھ سننے کی ضرورت ہے اور ان کی شکایات مخلصانہ انداز سے رفع کرنے کی ضرورت۔ خواتین کو مردوں سے شکایت ہے تو کچھ وجہ شکایت بھی ہے۔ جہاں قرآن مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت کا فیصلہ سناتا ہے' جہاں عورت پر مرد کی بالادستی کا اعلان کرتا ہے' وہاں یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ عورت کے حقوق اسی طرح ہیں جس طرح مرد کے حقوق عورت پر ہیں۔ لیکن عام گھروں میں' الا ماشاء اللہ' عورت کو ایک معتبر ملازمہ سے زیادہ حیثیت نہیں۔ کتنے صاحب خانہ ہیں جو گھر میں اس لئے زیادہ وقت دیتے ہیں کہ ان کی بیوی کا بھی کسی کے ساتھ گپ شپ لگانے کو جی چاہتا ہے۔ کتنے مرد ہیں جو گھر میں آکر کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ کتنے خاوند ہیں جو بیماری کی حالت میں بیوی کا سر دبا دیتے ہیں۔ کتنے شوہر ہیں جو بازار میں کھڑے رس گلہ پہ رس گلہ کھاتے ہوئے یہ سوچتے ہوں گے کہ گھر لے جا کر کھائیں تاکہ بیوی بچے بھی شامل ہو سکیں۔ کتنے باپ ہیں جو بیٹیوں کو وراثت میں ان کا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ کئی مسلمان یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ عورت تو پاؤں کی جوتی ہے' جب چاہا بدل دی۔ ایسا سلوک پا کر یا عورت سے ایسا سلوک ہوتا دیکھ کر مرد کے خلاف عورت کا شکوہ جائز ردعمل ہے۔ اس شکوے کو دور کیجئے آزادی کے مطالبے کا فتنہ از خود دم توڑ جائے گا۔ عورت کو عزت کا مقام دیجئے جس کی وہ حقدار ہے۔ اسے تعلیم دیجئے' اس کی تربیت میں ذاتی دلچسپی لیجئے' اسے باور کرائیے کہ دنیا و آخرت میں سرفرازی عورت کا گھر کی چاردیواری میں رہ کر اولاد کی صحیح تربیت کی مرہون منت ہے۔ چاردیواری میں رہنے کا مقصد قید دینا نہیں بلکہ خارجی مشکلات سے تحفظ فراہم کرنا ہے۔ پردہ عورت پر بے اعتمادی کی علامت نہیں بلکہ اسے نظر بد سے بچانے کی مخلصانہ کوشش ہے۔ مخلوط زندگی سے اجتناب کا مدعا اسے تفریح سے روکنا نہیں بلکہ اس کی عظمت کو دوبالا کرنا ہے۔ بیوی کے لئے گھر میں ایسا ماحول پیدا کیجئے کہ وہ بھی سکون سے کچھ وقت ستا لے اور اسے اپنے میاں کے لئے دیدہ زیب انداز اپنانے کے لئے وقت اور سہولت بھی میسر ہو۔ تفریح کی خاطر خواتین کا آپس میں مل بیٹھنے کا انتظام بھی وقتاً فوقتاً ضروری ہے۔ ایسا ماحول مرد مہیا کریں' عورت شرعی ستر و حجاب کی پابند ہوتے ہوئے گھر کو جنت بنا دے گی۔OO

## معذرت

قارئین کرام! گزشتہ شمارے میں جناب محمد صبیح کے مضمون "پاکستان سے پاکستان تک" کے شروع میں ادارہ کی طرف سے جو وضاحتی نوٹ شائع ہوا تھا جس میں غلطی سے یہ چھپ گیا تھا کہ اس مضمون کی پہلی قسط ۲۱ مارچ ۹۳ء کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں' جبکہ وہ قسط ۲۱ مارچ ۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ ہم اس سہو پر معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

## بقیہ : اخبارات سے اخبارات تک

نظر نہیں آتا' جس کی وجہ سے سیاستدان طبقہ اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ منتخب نمائندگی پر مبنی جمہوری نظام دراصل اس کا ابتدائی مرحلہ تھا جبکہ اگلا مرحلہ سوئس طرز کا بالواسطہ جمہوری نظام ہے' جس کے لئے موجودہ جمہوری نظام میں بنیادی تبدیلیاں درکار ہیں۔ مغرب کی ناکام خارجہ پالیسی' خاص کر بوسنیا کے مسئلے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پوری دنیا میں قیادت کا فقدان ہے اور اصل بوجھ عوام کے کندھوں پر ہے۔OO

(دی فرنٹیر پوسٹ' ۷/اگست ۱۹۹۵ء)

☆ ☆ ☆ ☆

# عوامی جمہوریت..... مگر کیسے؟

تحریر : Brain Beedhalm -- اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

## پوری دنیا میں جمہوریت احتساب کی زد میں ہے!

## یورپ کا کونسا ملک قیادت کے بحران سے دوچار نہیں!

**اگلے چند سالوں میں جمہوری نظام بنیادی تبدیلیوں سے دوچار ہو گا**

لوگ آج جس عدم اطمینان اور غیر یقینی کیفیت سے دوچار ہیں اس کی مثال کم از کم گزشتہ دو سو سالوں میں نہیں ملتی۔ پوری دنیا میں دیکھ لیں' کہنے کو بہت بڑے ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے ایک بھی ملک ایسا نہیں جہاں کوئی قابل ذکر قیادت موجود ہو۔

سابق کمیونسٹ بلاک کو چھوڑ بھی دیں' جہاں ابھی نئی نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں لیکن مستحکم جمہوریت کی حامل دنیا کہاں کھو گئی۔ کوئی ایک بھی شخصیت ایسی نہیں رہ گئی جس پر نگاہ ڈالی جا سکے۔ قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ جمہوریت کے چیمپئن امریکہ میں صدر بل کلنٹن اگلے سال ہونے والے صدارتی انتخابات میں بھی صدارت کے امیدوار ہیں جن کی مضحکہ خیز خارجہ پالیسی کے سبب امریکہ کا عالمی قیادت کا خواب خام خیال بن چکا ہے۔ جاپان میں بچے کھچے اعتدال پسندوں' جنہیں کبھی مکمل بالادستی حاصل تھی اور نظریاتی طور پر نیم جان سوشلسٹوں کی ملی بھگت سے قائم حکومت ہر لمحے پسپائی کی جانب مائل ہے۔ برطانیہ اپنے تشخص کے بحران سے نہیں نکل پا رہا جہاں جان میجر کا چل چلاؤ ہے۔ یہی حال گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے سپین کا ہے۔ اٹلی میں جہاں حکومت کی باگ ڈور ٹیکنو کریٹس کے ہاتھوں میں ہے' نمائندہ حکومت میسر نہیں آ رہی۔

جرمنی اور فرانس کا کہہ سکتے ہیں کہ تشویش کا پہلو نسبتاً کم ہے۔ فرانس کے نو منتخب صدر جیکوئس چورک نمایاں طور پر کامیابی حاصل کر کے آئے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اپنی اس طاقت کا وہ اظہار کیسے کرتے ہیں۔ ہلمٹ کوہل بلاشبہ کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر پارلیمنٹ میں ان کے پاس طاقت نہیں۔

اگرچہ اندرونی محاذ پر مشکل حالات کا بہتر انداز میں مقابلہ کیا ہے لیکن عالمی سطح پر کوئی ایک لیڈر بھی ایسا نہیں ہے جو دنیاوی طور پر بھی رعب اور دبدبہ رکھتا ہو اور قوت فیصلہ سے بھی لیس ہو۔

پیشتر ازیں نصف صدی پر محیط عرصہ سرد جنگ پر مشتمل تھا' جس میں زیادہ سے زیادہ اختیارات کی ضرورت تھی چنانچہ کسی بھاری بھرکم قیادت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے قبل دو عظیم جنگوں کا درمیانی دور ہے۔ اس میں مسولینی اور ہٹلر جیسے لیڈروں کا مقابلہ روزویلٹ اور چرچل سے تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے ایک صدی پہلے تک برطانیہ کو جو عروج حاصل تھا اس میں معمولی سطح کا وزیر اعظم بھی دنیا کے لئے کافی تھا۔ ادھر ۱۹ویں صدی کے بیشتر حصے میں برلن' ویانا' سینٹ پیٹرس برگ اور ٹوکیو میں بھی مقتدر اشخاص موجود رہے۔ ۱۸ویں صدی کا صرف ایک مختصر سا عرصہ ایسا ہے جو اس طرح بالکل ہی کسی نمایاں شخصیت سے خالی رہا ہو' جس طرح آج ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کا یوں حیرت انگیز طور پر دنیا کا کسی طاقت کے مرکز سے خالی ہو جانا بلاوجہ نہیں۔ بعض ممالک مثلاً اٹلی میں وہاں کے عوام کی سیاستدانوں سے مایوسی سب سب سے اہم سبب ہے۔ برطانیہ اور سپین کئی سالوں تک اقتدار کے مزے لوٹنے کے بعد اتنے "بوڑھے" ہو چکے ہیں کہ دوبارہ اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ جمہوری دنیا خیر سے یکسر خالی ہو گئی ہو۔ یہ بھی نہیں کہ ان کے پاس سرے سے طاقت باقی نہیں رہی بلکہ ہوا یہ ہے کہ سیاستدان طبقہ کا وہ احترام عوام میں باقی نہیں رہا جو کبھی اسے حاصل تھا۔ جس کے باعث محسوس ایسا ہو رہا ہے کہ جمہوری عمل میں ایک گہری تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔

چھوٹے سے ایک ملک سوئیزرلینڈ کو چھوڑ کر ہر جگہ اب تک جمہوریت سے مراد ایک ایسا نظام لیا جاتا رہا ہے جس میں عوام ہر مرتبہ چند لوگوں کو کچھ سالوں کے لئے منتخب کر کے اگلے انتخابات تک تمام معاملات ان کے سپرد کر کے فارغ ہو جاتے ہیں۔ ۱۹ویں صدی میں جب یورپ اور امریکہ میں جمہوریت کا آغاز ہوا تو اس وقت عام آدمی کے لئے ملکی معاملات کو سمجھنا اتنا آسان نہ تھا لہٰذا ایک ایسے طبقے کا وجود ناگزیر تھا جو سیاستدان کہلاتا ہے مگر بعد ازاں جب تعلیم عام ہونے لگی تو لوگوں میں آگہی پیدا ہوئی۔ پہلے اخبارات آئے' پھر ریڈیو اور ٹیلی وژن اور اب انٹرنیٹ۔ دنیا بھر کی معلومات پل بھر میں عام آدمی تک پہنچ جاتی ہیں۔ ہمارے باپ دادا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ تعلیم کی بدولت بھی املاک کا دائرہ وسیع ہوا ہے اور لوگوں کو رہن سہن کی سہولیات میسر آئی ہیں جس سے احساس ذمہ داری میں اضافہ ہوا ہے۔ مزید برآں عوام اور سیاستدانوں کے درمیان جو ایک فاصلہ موجود تھا وہ اب باقی نہیں رہا اور ایسی بہت ساری خامیاں جو پہلے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتی تھیں اب منظر عام پر آ جاتی ہیں۔ اب لوگ اپنے منتخب نمائندوں کے احتساب کی باتیں کرتے ہیں' خاص کر جب وہ دیکھتے ہیں کہ سیاستدانوں کی اولین ترجیح دولت جمع کرنا ہے۔ واشنگٹن' ٹوکیو' پیرس اور لندن ہر جگہ جمہوری نظام احتساب کی زد میں ہے جبکہ بدقسمتی سے کہیں بھی وہ اس آزمائش میں پورا اترتا

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

## بقیہ : گوشہ وطن

شفاف نظر آتے ہیں اور اس سے اختلاف کرنے والے ملک دشمن اور غدار ہیں' جن پر غداری کا مقدمہ چلنا چاہئے۔

جو لوگ صدر پاکستان کو مطعون کرتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی زیادتی ہے۔ جب تک ان کی آنکھوں پر طلسمی چشمہ لگا ہوا ہے وہ وہی کچھ دیکھیں گے جو وہ دکھائے گا۔ ایم۔ کیو۔ ایم کے رہنما الطاف حسین صاحب بار بار صدر کو خط لکھتے ہیں۔ یہ کار عبث وہ کیوں کرتے ہیں' سمجھ میں نہیں آتا۔ موٹی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کی تحریریں اس چشمہ سے نظر نہیں آسکتیں بلکہ اس چشمہ سے ان تحریروں میں دہشت گردی نظر آتی ہے۔

وزیر اعظم کی بات تو چھوڑیئے! ان کی ہر ہر ادا قابل معافی ہے۔ ان پر مشتعل نہیں ہونا چاہئے۔ وہ چوہا کہیں' بزدل کہیں' انہیں ستر ہزار خون معاف ہیں۔ زمانے کی گردش نے کوری اکینو (فلپائن) کا دور دیکھا ہے۔ اس دور میں عوام کس مصیبت میں گرفتار تھے۔ پھر اندرا گاندھی نے کیسے کیسے چرکے لگائے' وہ زخم آج تک ہرے ہیں اور شاید زندگی بھر ہرے رہیں۔ ہماری وزیر اعظم نے کراچی کے معاملے میں اتنی بڑی قسم کھا رکھی ہے جس کا کوئی کفارہ نہیں۔ لہٰذا ان کی طرف سے ہر آنے والے "تیر" کو اپنے سینے پر سجانا ہوگا۔

حق بات کہنے اور احتجاج کرنے کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ ایک ہی دروازہ ہے جو ہمیشہ سے کھلا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔ قوم بحیثیت مجموعی اگر اس دروازے کی طرف رخ کرے اور اس کا کنڈہ کھٹکھٹائے تب ہی کام چل سکتا ہے۔ کنڈہ کھٹکھٹانے کے بھی کچھ تقاضے ہیں جسے پورا کرنا پڑے گا اور وہ ہے ان کی جناب میں شعوری توبہ۔ اس کے بغیر وہاں بھی بات نہیں سنی جائے گی۔ خلوص دل سے توبہ اور رجوع الی اللہ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے یہ عذاب ٹل سکتا ہے۔○○

## بقیہ : افہام و تفہیم

بقول آپ کے پورا دھڑ (پاکستان) خطرہ سے دوچار ہو جائے گا۔ اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ انتظامی ضرورتوں کے تحت تقسیم ضلعی ہوتی ہے اور قومیتوں کو مطمئن رکھنے کے لئے تقسیم صوبائی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اصل مسئلہ انتظامی نہیں قومیت کے حقوق کا ہے' جس کی اسلام نفی نہیں کرتا بلکہ حفاظت کرتا ہے۔ یہ الگ صوبہ کے ذریعے ہی احسن طریقے سے حل ہو سکتا ہے۔

④ جہاں تک آپ کا یہ کہنا ہے کہ اردو بولنے والوں کے مطالبہ پر الگ صوبہ کا قیام گویا زبان کو اساس قومیت تسلیم کر لینے کے مترادف ہوگا۔ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ یہ مسئلہ امر پہلے ہی موجود ہے کہ پنجاب کا مطلب پنجابی بولنے والوں کا صوبہ' علی ھذا القیاس۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں فرمایا ہے' جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اور ہماری نشانیوں میں سے تمہارا رنگوں اور زبانوں کا تعدد بھی (بہت زیادہ اختلاف اور تعداد) ہے۔ گویا یہ مختلف زبانیں اور رنگ و نسل کا اختلاف تو اللہ ہی کا قائم کردہ ہے اور مطلوب بھی ہے۔ ان کی بنیادوں کو اللہ تعالیٰ بھی تسلیم کرتے ہیں بلکہ اپنی نشانی قرار دیتے ہیں۔ بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ ان تمام بنیادوں کو دینی اور ملی بنیادوں کے استحکام کے لئے استعمال ہونا چاہئے' نہ کہ انہدام کے لئے۔ چنانچہ زبان کی بنیاد پر صوبہ بننے سے ان شاء اللہ پاکستانی قوم مضبوط ہوگی اور پھر یہ ملت اسلامیہ کے استحکام کا سبب بنے گی' اس لئے کہ ملت ان ہی قوموں سے مل کر عبارت ہے۔ قدیم سندھی حضرات کے لئے الگ صوبہ سندھ جو ہوگا تو پھر ان کے اعتراض کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن اگر بقیہ صوبوں کے بھی ان ہی بنیادوں پر چھوٹے یونٹ (صوبے) بنا دیئے جائیں تو پھر ان شاء اللہ کوئی طوفان برپا نہ ہوگا البتہ خلوص نیت شرط ہے۔

امید ہے کہ آپ اس تمام پس منظر کو سامنے رکھ کر اور ہر قسم کے منفی احساسات سے بالاتر ہو کر خالصتاً پاکستانی اور قومی انداز فکر اختیار کریں گے تو ان شاء اللہ ڈاکٹر اسرار احمد کے اس تجزیئے سے متفق ہوں گے۔○○

## بقیہ : منبر و محراب

آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔"

(بحوالہ ترجمان القرآن' محرم ۱۳۶۵ھ - دسمبر ۱۹۴۵ء)

### مشترکہ مشاورتی کونسل

اس بات کو طے کرنے کے لئے کہ آیا یہ شرائط اس وقت پوری ہو رہی ہیں لہٰذا الیکشن میں حصہ لینا چاہئے' تینوں جماعتوں کے ارکان پر مشتمل ایک مشترکہ مشاورتی کونسل قائم کی جائے۔ مجوزہ کونسل میں ۵۰ فی صد نمائندگی جماعت اسلامی کو حاصل ہوگی جبکہ ۲۵ فی صد تنظیم اسلامی اور ۲۵ فی صد تحریک اسلامی کو حاصل ہوگی۔ فیصلہ کرنے کے لئے کونسل کے کل ارکان کی دو تہائی اکثریت لازم ہے جبکہ اس کے علاوہ ہر جماعت کے نصف ارکان کی رضامندی بھی ضروری ہوگی۔ اس تجویز پر اگر تینوں جماعتوں کا اتفاق رائے ہو جائے تو ایک وفاق وجود میں لایا جا سکتا ہے جو اگر اللہ نے چاہا تو سیکولرازم اور اباحیت پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے میں موثر ثابت ہوگا۔○○

## بقیہ : نقطہ نظر

کی نئے سرے سے تشکیل کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرے اور اس بات کی ضمانت دی جائے کہ کمیشن کی سفارشات سرد خانہ کی نذر نہیں ہو جائیں گی۔

کمیشن کے قیام کے اعلان سے گفتگو کا آغاز ہوگا جس سے تلخی میں کمی واقع ہوگی اور افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہوگی۔

میں نے ڈاکٹر اسرار احمد کے بے لوث اور درد مندانہ موقف کے حوالے سے اپنی بات شروع کی تھی' اسی پر ختم کرتا ہوں کہ "اگر اس ملک کو بچانا ہے تو پاکستان میں چھوٹے صوبے بنانے ہوں گے۔"

(بشکریہ THE UNIVERSAL MESSAGE

August ۱۹۹۵


# قرآن کالج لاہور میں

## ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

## اور بی اے تربیتی سال میں

## داخلے جاری ہیں!

○ درخواست داخلہ جمع کرانے کی آخری تاریخ ۲۱ ستمبر ہے۔

○ تدریس کا آغاز' ان شاء اللہ' اکتوبر کے پہلے ہفتے سے ہو جائے گا۔

المعلن :

پرنسپل قرآن کالج' لاہور

بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن!

## جناح سٹیڈیم اسلام آباد میں حکومت کی زیر سرپرستی مختلف کھیلوں کے لئے

# جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط ٹریننگ!

ناصر محمود غنی

پاکستان جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور جس کے دستور میں یہ بات واضح طور پر درج ہے کہ حاکمیت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے نیز کوئی قانون اسلام کے منافی نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس ملک میں ایسے ایسے غیر اسلامی کام کئے جا رہے ہیں جن کے غیر اسلامی ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ یہ نہ صرف غیر اسلامی ہیں بلکہ صریحاً شیطانی کام ہیں! ان شیطانی کاموں میں سرفہرست تو گورنمنٹ آف پاکستان کی سرپرستی میں چلنے والے ٹی وی اسٹیشن ہیں' لائسنس یافتہ ویڈیو سنٹر ہیں' ڈش انٹینا ہیں اور سینما گھر ہیں۔ ان سب کی اعلیٰ شیطانی کارگردگی کی وجہ سے اب مسلمان جوان مرد اور عورتوں نے شرم و حیاء کا لباس اتار کر ایسے کام کرنے شروع کر دیئے ہیں کہ جن کے تصور سے ہی مسلمان مرد اور عورت پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کے خوف کی وجہ سے لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

بے شرمی اور بے حیائی کے ان کاموں میں سے ایک کی نمائش آج کل جناح اسٹیڈیم اسلام آباد میں گورنمنٹ آف اسلامی جمہوریہ پاکستان کی زیر نگرانی ہو رہی ہے۔ مسلمان جوان خواتین کو مرد کوچز کے ذریعے مختلف کھیلوں کی ٹریننگ دی جا رہی ہے اور اسی اسٹیڈیم میں مرد کھلاڑی بھی خواتین کے ساتھ ساتھ ٹریننگ حاصل کرتے ہیں' مل کر دوڑتے ہیں اور گپ شپ لگاتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کھلاڑی کو وارم اپ ہونے کے لئے ایسی ورزشیں کرنا ہوتی ہیں جن میں پورے جسم کو یوں حرکت دی جاتی ہے جیسے "بریک ڈانس" میں حرکت دی جاتی ہے نیز کوچ کو کھلاڑی کے مختلف جسم کے حصوں کو پکڑ پکڑ کر پریکٹس کرانا ہوتی ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ یہ سب کام جناح سٹیڈیم میں مسلمان خواتین اور مرد ایک دوسرے کے سامنے اور مل کر کرتے ہیں۔ اس شیطانی عمل کے دوران خواتین نے چست ٹریک سوٹ اور اکثر مردوں نے صرف نیکر اور ساتھ بنیان پہنی ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ مرد اور خواتین کھلاڑیوں کو پاکستان سپورٹس کمپلیکس کے ایک ہی ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا ہے' جہاں وہ اپنے فارغ اوقات میں اونچی آواز میں گانے اور میوزک سنتے ہیں اور بارش میں خواتین مردوں کے سامنے باریک یا چست لباس پہن کر نہاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کیا کچھ ہوتا ہے اس کا علم اللہ علیم و خبیر کو ہے یا ان لوگوں کو جو ان شیطانی اعمال میں مصروف ہیں۔

میں اس اسلامی ملک کے محافظوں اور حکومت وقت سے سوال کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتے ہوئے مذکورہ بالا شیطانی کاموں کی سرپرستی کیوں کر رہے ہیں؟ میں سوال کرتا ہوں علماء اسلام اور کشمیر اور دوسرے ممالک میں جہاد کرنے والے مجاہدوں سے کہ کیا ان کو اپنا ملک تباہ و برباد ہوتا ہوا نظر نہیں آتا؟ کیا ان کو یہاں کفر کا سورج بلند ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا؟ کیا ان کو یہاں ظلم اپنی آخری حدیں چھوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا؟ کیا ان کو مسلمان کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہو کر جہنم میں جاتے ہوئے نظر نہیں آتے اگر آپ سب کو یہ سب کچھ نظر آتا ہے اور یقیناً نظر آتا ہوگا تو پھر آپ اپنے ملک کو تباہ و برباد ہونے سے روکتے کیوں نہیں؟ کفر کے سورج کو بلند ہونے سے روکتے کیوں نہیں؟ ظلم اور جہنم کا راستہ روکتے کیوں نہیں؟ یاد رکھیں! رب کی زمین پر اور رب کے نام پر لئے گئے ملک میں رب کے حکموں پر عمل نہ ہو' یہ رب کائنات کی توہین ہے اور اس ملک کے باقی نہ رہنے کی علامت ہے! تو کیا سب تنظیموں اور تمام مکتبہ ہائے فکر کے سربراہ ناموس رسالت کی طرح ناموس الٰہی پر جمع ہو کر اس مسلمان ملک کو ناموس الٰہی اور ناموس رسالت کی توہین کرنے والوں سے ہمیشہ کے لئے پاک نہیں کر سکتے؟

یاد رکھیں! اگر آپ نے ایسا کرنے کی کوشش نہ کی تو آپ بھی توہین الٰہی اور توہین رسالت ﷺ کرنے والوں کے ساتھ روز حشر کھڑے ہوں گے! اگر آپ نے جناح اسٹیڈیم میں ہونے والی خواتین کی ٹریننگ کو نہ روکا تو ۱۹۹۷ء میں اسی مسلمان ملک میں ۷۲ کروڑ روپے کے خرچ پر ہونے والی خواتین کی کھیلیں ہوں گی' جن کو سب ٹی وی پر دیکھیں گے اور شیطان کو داد دیں گے اور اللہ جبار و قہار مسلمانوں پر لعنت کرے گا کہ ان کی موجودگی میں شیطان کامیاب ہو گیا!!

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(اقبال)

## ہتھیاروں کے یہ ذخیرے کس کام کے لئے!

وزیر داخلہ کی طرف سے سینٹ میں نیشنل اسمبلی کے ان ممبران کی فہرست پیش کی گئی تھی جنہیں ممنوعہ اسلحہ پاس رکھنے کے لائسنس جاری ہوئے تھے۔ ان میں سے جناب آصف زرداری کے پاس چالیس لائسنس ہیں۔ معزز اراکین اسمبلی کے پاس موجود کل آتشیں اسلحہ اس اسلحہ سے زیادہ ہے جو ایک پورے ملک ہیٹی (Haiti) کے پاس کسی بیرونی حملے کے خلاف اپنے دفاع کے لئے ہے۔ پھر بھی ہمارے سیاستدان شور مچاتے رہتے ہیں کہ باہر سے آ کر لوگ یہاں دہشت گردی کر جاتے ہیں۔

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

گوشہ وطن

# "چشمہ" کی کرامات!

## جناب صدر! پارٹی کا چشمہ اتار کر حالات کا جائزہ لیجئے

## کیا ہمارے سیاستدان "حلف" پورا نہ کرنے کا حلف اٹھاتے ہیں؟

نجیب صدیقی

ہر صبح کا اخبار ہولناک خبریں لے کر آتا ہے۔ کراچی میں صبح سے شام تک لاشوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں' گھر اجڑ رہے ہیں' عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں' بچے یتیم ہو رہے ہیں مگر حکومت اپنی "انا" کے مینار پر بیٹھی ہوئی قہقہے لگا رہی ہے۔ موت کا شیطانی رقص جاری ہے۔ شیطان کے ساتھ اس رقص میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جن لوگوں نے ملک کی سلامتی اور امن قائم کرنے کا حلف اٹھا رکھا ہے۔ اب حلف کی حیثیت بھی کیا رہی ہے۔ عدالتوں کے باہر ایسے کئی پیشہ ور آپ کو مل جائیں گے جو گواہی دینے کے لئے ہر قسم کا حلف اٹھالیں گے۔ اقتدار کی کرسی پر بیٹھتے وقت بھی تو حلف اٹھایا جاتا ہے مگر اس کی پاسداری تو وہ کرے جو خدا کو حاضر و ناظر سمجھتا ہو۔ ایسا شخص جو خدا کو ہر وقت موجود سمجھے اور صمیم قلب سے سمجھے کہ حلف اٹھانے کے بعد وہ صحیح رخ پر چلے گا۔ مگر ہمارے ملک میں حلف کی حیثیت ایک خانہ پری ہے جو بغیر سوچے سمجھے کی جاتی ہے۔ حلف کی جوابدہی کا اگر احساس ہوتا تو ہمارا معاشرہ شر اور فساد سے یوں دوچار نہ ہوتا۔ یہاں تو ناانصافی کو "انصاف" جھوٹ کو سچ اور ہر غلط کاری کو "فن" سمجھا جاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں جو مسائل کے انبار نظر آتے ہیں اور جن کو حل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی' اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ حلف اٹھانے والوں نے حلف سے صریح روگردانی اختیار کر رکھی ہے۔ جو لوگ حالات کو درست کرنے کے ذمہ دار ہیں وہی اگر جلتی پر تیل چھڑکنے لگیں تو یہ آگ کیسے بجھ سکتی ہے؟ اس ملک میں جو شخص بھی برسراقتدار آتا ہے اس کی آنکھ پر اپنی پارٹی کا موٹا چشمہ لگ جاتا ہے۔ وہ ہر شے کو اپنی پارٹی کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اپنی پارٹی کے لوگ تو اسے پارسا' راست گو اور فرشتہ اور تمام عیوب سے پاک نظر آتے ہیں جبکہ دوسری پارٹی کے لوگ بدعنوان' بے ضمیر' بدعہد' جھوٹے اور ملک دشمن نظر آتے ہیں۔ اب ایک نئی اصطلاح "دہشت گرد" کی بھی شامل ہو گئی ہے۔ وہ دبیز چشمہ صرف وہ چیز دیکھتا ہے جسے وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے مناظر تو اسے نظر نہیں آتے' اگر آتے بھی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے۔ مسائل کے حل کا بھی یہی انداز ہے۔ ملازمتوں اور دعوتوں تک میں وہ چشمہ ہی کارفرما نظر آتا ہے۔

> اس ملک میں جو بھی برسراقتدار آتا ہے' اس کی آنکھ پر پارٹی کا موٹا چشمہ لگ جاتا ہے' وہ ہر شے کو اپنی پارٹی کی آنکھ سے دیکھتا ہے

اس چشمے کی کرامات دیکھئے کہ کراچی میں جو بھی دہشت گردی ہوتی ہے' اس چشمہ کی بدولت وہ سب ایم - کیو- ایم کے کھاتے میں ڈالی جاتی ہے۔ ایم- کیو- ایم کے روزانہ متعدد افراد ہلاک کئے جاتے ہیں مگر وہ چشمہ بتاتا ہے کہ یہ ہلاکت بھی ایم- کیو- ایم کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اسی طرح "فرزانہ سلطان" کیس کو بھی اسی چشمہ سے دیکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بھی ایم- کیو- ایم کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔

موجودہ صدر محترم جناب فاروق احمد لغاری صاحب نے حلف اٹھایا تو قوم کو یہ مژدہ سنایا کہ وہ اس چشمہ کو اتار دیں گے جو ان کی پارٹی نے انہیں پہنایا تھا اور اب وہ "قومی چشمہ" لگائیں گے' جس سے ہر منظر صاف نظر آئے گا۔ حلف اٹھانے کے بعد شاید انہیں "قومی چشمہ" نہیں مل سکا اور وہی چشمہ لگا لیا جس کو اتارنے کا حلف اٹھایا تھا۔ پارٹی کا چشمہ تو وہی دکھائے گا جو پارٹی دکھانا چاہے گی' اور جو منظر وہ دیکھے گا وہی بیان کرے گا۔ اس میں اس کا اپنا قصور کیا ہے؟

جو لوگ ان سے بڑے خیر کی توقع رکھتے تھے' وہ بہت مایوس ہوئے ہیں۔ ان کی نماز' روزہ' تہجد' حرم کے آنسوؤں کے حوالے سے انسان دوستی اور حب الوطنی کی توقع رکھنے والے مایوس ہوئے ہیں تو اس میں جناب صدر کا کوئی قصور نہیں!!۔ یہ سب چشمے کی کرامت ہے۔ کون نہیں جانتا ہے کہ دنیا کی تمام عدالتیں پولیس کے سامنے اقراری بیان کو مسترد کر دیتی ہیں۔ پولیس کا کردار تو سورج سے زیادہ روشن ہے۔ کسی آدمی کے "پارسا" ہونے کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ پولیس میں ہے۔ حکومت خود اس بات کی معترف ہے کہ کالی بھیڑوں کی بڑی تعداد پولیس کے محکمے میں ہے۔ منشیات کا کاروبار اس کے انہی "پارساؤں" کے زیر سایہ چلتا ہے۔ اکثر ڈکیتیوں میں یہی پکڑے جاتے ہیں۔ اس سب کے باوجود اس چشمے نے اپنے آرڈی نینس کے ذریعہ پولیس کے سامنے اقراری بیان کو حتمی بنا ڈالا۔ اب ٹی وی میں ایک مستقل پروگرام دیکھنے میں آرہا ہے کہ اقراری ملزم آ کر نئے نئے انکشافات کرنے لگتے ہیں۔ یہ کھیل بڑا پرانا ہے۔ بھٹو دور کے بعد "ظلم کی داستانیں" ٹی وی پر مسلسل آتی رہی مگر اس پارٹی کا گراف نہیں گرا۔ یہ چشمہ ہی کی کرامت ہے کہ پارٹی کے تمام لوگ صاف

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

"پارٹی کا چشمہ تو وہی دکھائے گا جو پارٹی دکھانا چاہے گی' جو منظر وہ دیکھے گا وہی بیان کرے گا"